۱۶ فروری ۲۰۲۱ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۴ ۔ شمارہ نمبر: ۴

پندرہ روزہ
معارف فیچر
کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر:
سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۹۲۔۲۱)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطہ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

لیبیا میں سیاسی استحکام کی ضرورت

David Hearst

فرانس، مصر اور ترکی کے حمایت یافتہ امیدواروں کو مسترد کر کے لیبیا کے مندوبین نے ماضی کی سیاست کو مسترد کرنے کا عندیہ دیا ہے۔ حال ہی میں جنیوا میں بعض عجیب باتیں ہوئیں۔ جنیوا کا شمار اُن شہروں میں نہیں ہوتا جو آج کل مشرقِ وسطیٰ سے متعلق اہم فیصلوں کے مراکز میں سے ہیں۔ لیبیا میں عبوری حکومت کے قیام کے لیے عالمی برادری کے حمایت یافتہ امیدوار اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ہونے والے حالیہ مذاکرات میں لیبیا کے مندوبین کی منظوری حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اس کے بجائے نسبتاً غیر معروف سیاست دانوں کے ایک گروپ کو لیبیا میں سالِ رواں کے آخر میں ہونے والے انتخابات تک کے لیے عبوری حکومت کے قیام کے لیے منتخب کیا گیا۔ ذرائع بتاتے ہیں کہ عبوری حکومت کے قیام کے لیے جنہیں چُنا گیا ہے وہ لیبیا کی سیاست میں بہت حد تک زمینی حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے تحت ہونے والے انتخابات کے امیدواروں کی تمام فہرستوں نے لیبیا کے مشرقی، مغربی اور شمالی علاقوں میں تقسیم گہری کی ہے مگر خیر، اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ سب یہ سمجھ رہے تھے کہ ملک کے مشرقی حصے سے تعلق رکھنے والے پارلیمنٹ کے اسپیکر اغیلا صالح (Aguila Saleh) صدارتی کونسل کے سربراہ منتخب ہوں گے مگر ایسا نہ ہوا۔

لیبیا کو امن اور اتحاد کی طرف لے جانے کی کوشش سے قبل اغیلا صالح کو اپنے دامن سے چند دھبے دھونے ہیں۔ انہوں نے طرابلس پر حملے کی ناکام کوشش میں ایسٹرن کمانڈر خلیفہ ہفتار کی مدد کی تھی۔ وہ لیبیا کے دارالحکومت طرابلس سے ملک کے وسط میں سرطے لے جانا چاہتے تھے۔ خلیفہ ہفتار کی افواج آج کل اسی علاقے میں قیام پذیر ہیں اور انہیں روس کی حمایت بھی حاصل ہے۔

اغیلا صالح ہی نے لیبیا کے قبائلی رہنماؤں کو جمع کیا تھا، جنہیں مصر کے صدر جنرل عبدالفتاح السیسی نے لیبیا پر حملے کی دھمکی بھی دی۔ اغیلا صالح نے مصر کے صدر کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اگر قومی مصالحت کی حمایت یافتہ فوج سرطے پر حملہ کرے تو وہ مداخلت کریں۔ گزشتہ جون میں طرابلس پر حملے کی ناکام کوشش کے بعد خلیفہ ہفتار کے حامی فوجیوں نے پسپا ہوتے ہوتے سرطے ہی میں قدم جمائے تھے۔ صالح مصر نواز ہیں اور وہ اس بات کے لیے کوشاں رہے ہیں کہ لیبیا میں ایک ایسا کٹھ پتلی سربراہِ مملکت و حکومت لایا جائے جو مصر کے کہنے پر چلے۔ جنیوا میں جب صالح کو منظوری نہ مل سکی تو قاہرہ میں ردِعمل خاصا اشتعال آمیز تھا۔

مصر کے معروف ٹی وی اینکر اور صدر السیسی کے غیر علانیہ ترجمان مصطفیٰ بکری نے ایک ٹویٹ میں کہا کہ اقوام متحدہ کی وساطت سے کیے جانے والے فیصلے کی بساط الٹ دی جائے گی۔ اپنے ٹویٹ میں انہوں نے کہا کہ اخلاقی جواز نہ رکھنے والے کو انتخابات کے ذریعے ملک کی حکمراں کونسل کا سربراہ منتخب کرنا ملک کے خلاف سازش کے سوا کچھ نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اخوان المسلمون کو ایک بار پھر سامنے لایا جا رہا ہے۔ کوشش کی جا رہی تھی کہ اغیلا صالح کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی تیاری کی جائے۔ ہم ایسا ہونے نہیں دیں گے۔

اخوان المسلمون نے بھی ملی جلی حکمتِ عملی اپنائی ہے۔ ایک طرف تو اُس نے اغیلا صالح کے حمایت یافتہ امیدواروں کی حمایت کا اعلان کیا اور دوسری طرف جیتنے والے امیدواروں کی حمایت بھی کی۔ یہ کام الگ الگ پلیٹ فارم سے ہوئے۔

اب قاہرہ نے بھی ذہن تبدیل کیا ہے اور لیبیا میں نئی حکومت کی تشکیل کے حوالے سے ابھرنے والے نئے چہروں کو بھی اپنانے کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ مصر کے صدر جنرل عبدالفتاح السیسی نے خلیفہ ہفتار کی افواج کی حمایت کی تھی مگر جب طرابلس پر حملے کی کوشش ترک افواج کی مدد سے ناکام بنادی گئی تب السیسی نے خلیفہ ہفتار کی حمایت سے بھی ہاتھ اٹھالیا۔ جب ترکی کی بالادستی واضح ہوگئی تب مصر کی انٹیلی جنس نے ترک انٹیلی جنس سے گفت و شنید کی اور اس معاملے میں خلیفہ ہفتار کو اعتماد میں نہیں لیا گیا۔

اغیلا صالح اس بات چیت کا حصہ تھے جس میں ترکی اور فرانس کے حمایت یافتہ وزیر داخلہ فتحی بغاشہ بھی شامل تھے۔ جب یہ لوگ ناکام ہوگئے تب اغیلا صالح سمیت تمام فریقین نے نئی صدارتی کونسل کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا۔

اندرونی صفحات پر:۔

- امریکا کے لیے ایشیا میں چیلنج
- بحیرۂ روم: اردوان کیا چاہتے ہیں؟
- میانمار کو تنہا نہیں کرنا چاہیے!
- نائیجیریا، پولیس کے خلاف نوجوانوں کی تحریک
- جمہوریت کا عالمگیر عہدِ زوال؟
- مضبوط خاندان مضبوط معاشرہ
- معرکۂ محبت اور سرفروشی کی تمنا
- میانمار میں کیا ہوا؟

غیر متوقع فاتحین

تمام غیر متوقع فاتحین نے بدلتی ہوئی صورتِ حال میں پیچھے رہنا گوارا کیا ہے۔ یہ حقیقت انہوں نے بھلائی ہے نہ نظر انداز کی ہے کہ حالات کی تبدیلی نے انہیں عارضی طور پر اقتدار کے ایوان تک پہنچایا تھا۔

نئے وزیر اعظم عبدالحامد دبیبہ خود کو کاروباری اور ٹیکنو کریٹ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کا تعلق مسراطہ کے علاقے کے ایک انتہائی مالدار خاندان سے ہے اور انہوں نے تعمیرات کی صنعت میں نام کمایا ہے۔ ان کا مرکزی کاروباری علاقہ قذافی ہے۔ عبدالحامد دبیبہ کے کزن علی دبیبہ سابق آمر کرنل معمر قذافی کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ وہ آرگنائزیشن فار ڈیویلپمنٹ آف ایڈمنسٹریٹو سینٹر کے سربراہ تھے۔ جیسے ہی انقلاب رونما اور برپا ہوا، عبدالحامد دبیبہ نے انقلابیوں کی فنڈنگ شروع کردی۔ ۲۰۱۷ء میں وہ مسراطہ کے اُس وفد کے رکن تھے جس نے ماسکو اور گروزنی کا دورہ کیا۔

لیبیا میں ہر کیمپ منقسم ہے۔ عبدالحامد دبیبہ کے معاملے میں بھی ایسا ہی تھا۔ مسراطہ سے تعلق رکھنے والے دو امیدواروں بشاغہ اور احمد امیطق کے درمیان سمجھوتے کے نتیجے میں عبدالحامد دبیبہ کی پوزیشن محفوظ رہ سکی۔ عبوری حکومت کے کامیاب امیدواروں کی فہرست کے سربراہ محمد المنفی ہیں، جن کا تعلق تبروک کے علاقے سے ہے۔ وہ بن غازی کی جنگ اور طرابلس پر حملے کے مخالف تھے۔ وہ خلیفہ ہفتار کے سخت ترین ناقدین میں سے ہیں۔

جی این اے نے محمد المنفی کو یونان میں لیبیا کا سفیر مقرر کیا تھا مگر جب انہوں نے ترکی اور لیبیا کے درمیان طے پانے والے بحری معاہدے کی حمایت کی تو یونان نے انہیں نکال باہر کیا۔ ان کے دو نائبین کی سیاست میں برائے نام دلچسپی ہے۔ ان میں موسیٰ الکونی بھی شامل ہے جو عالمی شہرت یافتہ ناول نگار ابراہیم الکونی کا بھائی ہے۔ کونی قبیلے کے لوگ جنوبی لیبیا میں زیادہ تعداد میں اور اقتدار کے حوالے سے مضبوط ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انہی کو آگے آنے کا موقع کیوں دیا گیا اور انہیں کیوں نہیں دیا گیا جنہوں نے طویل مدت تک جنگ لڑی؟ اغیلا صالح اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اپنی ہی تاریخ دوبارہ نہیں لکھ سکتے۔ لیبیا کے مندوبین کم سے کم متنازع افراد کو سامنے لانا چاہتے تھے۔ دونوں فہرستوں میں زیادہ الجھاؤ ان دشمنوں کے باعث رونما ہوا جو تبروک میں اغیلا صالح نے بنائے تھے۔

مشرق میں سابق اتحادی بھی دارالحکومت کی تبدیلی کے حوالے سے اغیلا صالح کے منصوبے سے تشویش میں مبتلا تھے۔ نیا دارالحکومت خلیفہ ہفتار کے کنٹرول میں ہوتا۔

بُرے ہارنے والے

ماہ رواں میں ہونے والے ووٹ نے بہت کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔ جب انتخابی نتائج واضح ہو گئے تب ترک صدر رجب طیب ایردوان نے عبوری وزیر اعظم اور صدارتی کونسل کے سربراہ کو فون کر کے مبارک باد دینے میں دیر نہیں لگائی۔ اس ڈیل میں جو لوگ ناکام رہے تھے انہوں نے بھی ڈوبتے جہاز سے کودنے میں خاصی تیزی دکھائی۔ فرانس کے صدر ایمانویل میکراں نے بھی محمد المنفی اور عبدالحامد دبیبہ سے بات کی۔ واضح رہے کہ محمد المنفی کو یونانی حکومت نے بھی مبارک باد دی جبکہ یہ محمد المنفی ہی تھے جنہیں یونانی حکومت نے نکال دیا تھا۔ معاملات کتنی تیزی سے اور کس حد تک بدلتے ہیں۔

مگر خیر، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ لیبیا میں اقتدار کی جنگ ختم ہو چکی ہے۔ ابھی بہت کچھ ہونا ہے۔ مصر نے بھی اب خلیفہ ہفتار سے کنارا کش رہنے کو ترجیح دینا شروع کر دیا ہے تاہم اس کے سب سے بڑے حامی متحدہ عرب امارات نے اب تک اپنی لائن تبدیل نہیں کی ہے۔ روسی صدر ولادیمیر پوٹن نے بھی خلیفہ ہفتار کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ روس کی مشنری فورسز سرطے اور الجفر ایئر بیس کی حفاظت پر مامور ہیں۔

اس ڈیل کے ہارنے والوں میں متحدہ عرب امارات، روس اور فرانس شامل ہیں جنہوں نے اب تک شمالی افریقا میں جمہوریت اور حقیقی عوامی نمائندوں کے ایوان اقتدار تک پہنچنے کے لیے برائے نام احترام کا بھی اظہار نہیں کیا۔ اور سمجھا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اب تک لیبیا کے حوالے سے اپنے منصوبے بھی ترک نہیں کیے ہیں۔ گزشتہ اپریل میں خلیفہ ہفتار نے خود کو لیبیا کا اصل حکمراں قرار دیا تھا۔ اس وقت وہ کسی بھی سیاسی عمل کا حصہ نہیں۔ ایسے میں یہ تو بہت دور کی بات ہے کہ کسی بین الاقوامی معاہدے کے تحت انہیں احترام کی نظر سے دیکھا گیا ہو۔ اگر سیاسی عمل ایک بار پھر ناکامی سے دوچار ہو تو سوچا جاسکتا ہے کہ خلیفہ ہفتار ایک بار پھر اقتدار کے ایوان تک رسائی کی تھوڑی بہت کوشش کر سکتا ہے یا کم از کم انتخابات کی طرف جانے والے معاملات کی راہ میں تو دیوار بن ہی سکتا ہے۔

عبدالحامد دبیبہ کے پاس پارلیمان سے منظوری کے لیے اپنی کابینہ منظر عام پر لانے کے لیے تین ماہ ہیں۔ عبدالحامد دبیبہ نے ترک خبر رساں ادارے انادولو سے انٹرویو کے دوران پارلیمان کے اُس جز کو قبول کرنے سے واضح انکار کیا ہے، جو تبروک میں ہے۔ عبدالحامد دبیبہ کہتے ہیں کہ اصل فیصلہ اب عوام کو کرنا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ لیبیا کے عوام کس طرح کی پارلیمان چاہتے ہیں۔

ملک کے مشرق میں خلیفہ ہفتار کی حمایت سے عبداللہ الثانی کی قیادت میں قائم حکومت نے عبوری حکمراں کونسل کو اقتدار کی منتقلی پارلیمان کی منظوری سے مشروط کردی ہے۔

پارلیمان کے متعدد ارکان تبروک جا چکے تھے مگر اب وہ طرابلس لوٹ آئے ہیں جو اس امر پر احتجاج کے لیے ہے کہ اغیلا صالح نے انہیں اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے بروئے کار لانے کی کوشش کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں دارالحکومت سرطے منتقل کرنے کا خیال بھی زیادہ پُرکشش دکھائی نہیں دیا ہے۔

اب اس کا امکان ہے کہ پارلیمان، جو بہت حد تک نمائندہ ہے، عبدالحامد دبیبہ کو عبوری حکومت قائم کرنے کے لیے گرین سگنل دینے میں دیر نہیں لگائے گی۔ اگر پارلیمان ایسا کرنے میں ناکام رہتی ہے تو فیصلہ گھوم کر اُن ۷۵ مندوبین تک جائے گا جنہوں نے اس معاہدے کی منظوری دی تھی۔ ویسے ملک بھر میں عمومی سطح پر یہ تاثر اور اعتماد پایا جاتا ہے کہ عبوری حکومت قائم ہوگی اور ٹیک آف میں بھی کامیابی حاصل کرے گی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ عبوری حکومت کا حصہ بننے والوں کو سالِ رواں کے آخر میں ہونے والے عام انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی سطح پر جو کچھ بھی ہوا ہے وہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔ بہت سی خرابیاں اب بھی برقرار ہیں مگر پھر بھی امید کی جانی چاہیے کہ لیبیا میں خانہ جنگی ختم کرنے کی راہ اب ضرور ہموار ہوگی۔ یہاں یہ نکتہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اگر خلیفہ ہفتار نے طرابلس پر قبضہ کرلیا ہوتا تو معاملات بہت مختلف ہوتے۔ خلیفہ ہفتار کے جنگجو طرابلس کے قلب سے محض سات کلومیٹر دور رہ گئے تھے۔ ان کی کامیابی کی صورت میں لیبیا کو بھی اپنے حصے کا السیسی مل گیا ہوتا۔ ایسا ہوا ہوتا تو فرانس اور روس بڑھ کر خلیفہ ہفتار کا خیر مقدم کرتے، جس کے نتیجے میں تیل اور ہتھیاروں کے بڑے معاہدے روسی اور فرانسیسی کمپنیوں کو ملے ہوتے۔ لیبیائی ملیشیا کے علاوہ خلیفہ ہفتار کے جنگجوؤں کو روکنے والی قوت ترکی کے ڈرون تھے۔ فرانس کی طاقت کو طاقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

باقی صفحہ نمبر ۱۰

امریکا کے لیے ایشیا میں چیلنج

Evan A. Feigenbaum

ٹرمپ انتظامیہ کے تجربہ کار سفارت کاروں کا کہنا ہے کہ انہوں نے بڑی طاقتوں خاص کر چین سے مسابقت میں اضافہ کر کے امریکی خارجہ پالیسی کو تبدیل کر دیا ہے۔ ٹرمپ کے سابق قومی سلامتی کے مشیر ایچ آر میک ماسٹر کے مطابق چین سے مسابقت میں اضافہ سرد جنگ کے بعد امریکی خارجہ پالیسی میں سب سے بڑی تبدیلی ہے۔

جیو پولیٹکس کے حوالے سے کھیل، کاروبار اور طرزِ زندگی میں مقابلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ واشنگٹن کو چین کو قابو کرنے کے لیے بہتر انداز میں مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ طریقہ کار حقیقت پسندانہ اور قابل عمل ہونا چاہیے۔ بدقسمتی سے امریکا ان معیارات پر پورا نہیں اترتا۔ امریکا کی تین بڑی اسٹریٹجک غلطیوں نے اس کی مسابقتی حیثیت کو کمزور کیا، ایشیا میں کامیابی کے لیے نومنتخب صدر جو بائیڈن کو ایسی انتظامیہ کی ضرورت ہے جو باتیں کم اور کام زیادہ کرے، تصورات کی دنیا سے دور ہو اور اپنی اصل طاقت کا فائدہ اٹھا سکے۔ چین کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے ایشیا میں مزید شراکت داروں کی ضرورت پڑے گی۔ ایشیائی ریاستیں بھی چین کا مقابلہ کرنے اور امریکی تعاون سے خطے میں طاقت کا توازن بہتر بنانے کی خواہاں ہیں۔ انہیں معاشی اور اپنی سرزمین کی حفاظت کے لیے امریکا کی مدد کی ضرورت ہے۔ خطے میں نقشہ کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ چین واحد ملک ہے جو ایشیا کے شمال مشرق، جنوب مشرقی، جنوب اور وسطی علاقے میں جغرافیائی طور پر پھیلا ہوا ہے۔ چین کی اس جغرافیائی برتری کا امریکا کے پاس کوئی توڑ نہیں ہے۔ کیوں کہ بیجنگ پاکستان سے مغربی چین تک شاہراہ تعمیر کر سکتا ہے، لیکن واشنگٹن قازقستان سے کیلیفورنیا تک پل نہیں بنا سکتا۔ اسی لیے جب امریکا چین کے انفرااسٹرکچر منصوبوں کی مخالفت کرتا ہے تو اس کا بہتر متبادل دینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ واشنگٹن کو اپنی صلاحیت کے مطابق چین سے مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جن میں سرمائے تک رسائی، بہترین کمپنیاں، دنیا کو شکست دینے والی ٹیکنالوجی اور عالمی سطح پر تجارتی سامان کی نقل وحمل کا نظام شامل ہے۔ لیکن بدقسمتی سے امریکا تجارتی طور پر یوریشین خطے کے دو تہائی میں کہیں نظر ہی نہیں آتا ہے، امریکی کمپنیاں اور سرمایہ وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ امریکا وسطی ایشیا، جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں اپنی محدود موجودگی کو بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

درحقیقت چین ایشیا کے بڑے حصے پر تاجر، بلڈر اور قرض فراہم کرنے والے کے طور پر موجود ہے، لیکن پھر بھی امریکا ایشیائی شراکت داروں کو اپنی سرحد کا دفاع کرنے اور سستے سامان کی فراہمی کی وجہ سے معاشی خرابی کا مقابلہ کرنے پر ابھر رہا ہے۔ گزشتہ برس سیکرٹری خارجہ مائیک پامپیو نے وسط ایشیا، جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کا دورہ کر کے امریکی اقدامات کو بڑھاوا نہیں دیا بلکہ یہ دورہ صرف چین کا مقابلہ کرنے کے لیے تھا۔ اس کوشش کا نتیجہ ان ممالک کے متضاد بیانات کی شکل میں الٹا نکلا۔ اصل میں پامپیو اور ٹرمپ انتظامیہ نے سابق نائب سیکرٹری خارجہ رچرڈ آرمیٹج سے منسوب قول الٹا کر دیا تھا کہ ’’ایشیا کو ٹھیک رکھنے کے لیے چین کے ساتھ ٹھیک رہا جائے‘‘۔ ٹرمپ انتظامیہ نے ایشیائی حکومتوں کو پیغام دیا کہ امریکا کی خطے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں بلکہ وہ صرف بیجنگ سے اسٹریٹجک مقابلے کے لیے ان ممالک کو پراکسی کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ واشنگٹن کی حیثیت خطے میں کمزور ہو رہی ہے، یہ رویہ بظاہر تو کامیاب ہے لیکن علاقائی حکمت عملی کے طور پر ناکام رہے گا۔ دوسری غلطی چین کے ساتھ اسٹریٹجک مقابلے کو صرف سکیورٹی چیلنج کے طور پر لینا ہے، حالانکہ یہ مسئلہ معاشی بھی ہے۔

چین امریکی سلامتی کے لیے ایک ناقابل تردید خطرہ ہے، لہٰذا خطرے کا تدارک کرنا بھی اہم اسٹریٹجک ترجیح ہونی چاہیے۔ جب تک چین اور جاپان ۱۹۴۵ء میں فرانس اور جرمنی کے طرز کے معاہدے تک نہیں پہنچ جاتے بحرالکاہل میں اجتماعی سکیورٹی کی کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ اس بات کا کوئی امکان نہیں اس لیے امریکی دفاعی قیادت کو ایشیا میں مرکزی حیثیت حاصل رہے گی۔

جب تک واشنگٹن اتحاد، دفاعی شرکت داری، اپنی افواج کی رسائی بہتر بنانے اور اسلحہ کی جدید کاری میں سرمایہ کاری جاری رکھے گا، تب تک ایشیا میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے والا اہم ترین ملک بنا رہے گا۔ جاپان سے ویتنام تک لگ بھگ ہر ایشیائی ملک چین کی طاقت سے خوفزدہ ہے اور بیجنگ کی بڑھتی بحری طاقت کا سامنا کرنے کے لیے امریکا سے مضبوط تعلقات کا خواہاں ہے۔ لیکن اگر واشنگٹن خطے میں اپنا سکیورٹی کردار بڑھاتا بھی ہے تو اس کی معاشی برتری خطرے میں ہے۔ امریکی کامیابی صرف خطے کو سکیورٹی فراہم کرنے میں نہیں ہے، بلکہ واشنگٹن کو ایشیائی برآمدات میں بھی مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیے اور خطے کے لیے قابل تقلید مثال بھی۔

مسئلہ یہ ہے کہ مشرقی ایشیائی معیشتیں تیزی کے ساتھ اپنی مانگ کو بڑھا رہی ہیں، جبکہ امریکا اور ایشیا کے درمیان تجارت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں بہتری کے لیے امریکا کو ایشیا میں اپنے دیرینہ کردار کو بڑھانا چاہیے۔ لیکن ٹرمپ ٹرانس پیسیفک معاہدے سے دستبردار ہو گئے، جسے اب جامع اور ترقی پسند ٹرانس پیسیفک پارٹنر شپ کہا جاتا ہے۔ امریکا ان دونوں معاہدوں سے دستبردار ہو چکا ہے۔ ان معاہدوں نے ایشیا میں تجارت اور سرمایہ کاری کے معیارات طے کر دیے تھے۔ ایشیا میں صرف سکیورٹی کردار کو بڑھانے سے واشنگٹن کو فائدہ نہیں ہونے والا، کیوں کہ وہ ایک ایسی فوجی طاقت ہوگی جس پر بیجنگ کے علاوہ سب انحصار کرتے ہیں لیکن معاشی شراکت داری کے لیے انحصار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

بھارت ایک اہم شراکت دار ہوتے ہوئے بھی سی پی ٹی پی پی اور آر سی ای پی جیسے اہم معاہدے سے باہر ہے۔ ان معاہدوں کا مقاصد چین سے اسٹریٹجک مقابلہ کرنا تھا، اگر انڈو پیسفک اور بحرالکاہل کے ممالک بھی ان کا حصہ نہیں ہوں گے تو امریکا کو ان معاہدوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایک اور غلطی مالیاتی بحران کے بعد سے تبدیلی کا پیمانہ ختم کرنا تھا، بہرحال امریکا وقت کے پہیے کو پیچھے نہیں گھما سکتا۔

ایشیا میں اب صنعتکاروں اور برآمد کنندگان کے علاوہ صارف اور درآمد کنندگان بھی موجود ہیں، یہ صرف سرمایہ وصول نہیں کرتے بلکہ سرمایہ کاری بھی کرتے ہیں۔ اقتصادی انضمام ایشیا کو مزید ایشیائی بنائے گا، ورنہ یہ خطہ چینی تسلط میں چلا جائے گا، جس کا امریکا کو خوف بھی ہے۔ بیجنگ بھی سی پی ٹی پی پی معاہدے میں شامل نہیں ہے۔ بہرحال جاپان جنوب مشرقی ایشیا اور بھارت میں سرمایہ کاری میں چین کے مقابلے میں بہت آگے ہے۔ خطے کی تبدیل شدہ صورتحال میں امریکی حکمت عملی کو آگے بڑھانا بائیڈن کا امتحان ہے۔ ایشیا میں دوبارہ امریکا کو مرکزی حیثیت دلانے کا تصور لاحاصل ہوگا۔

باقی صفحہ نمبر ۱۰

بحیرۂ روم: ایردوان کیا چاہتے ہیں؟

Zenonas Tziarras, Jalel Harchaoui

گزشتہ جولائی سے ترک بحری افواج کا ایک تیل بردار بحری جہاز جو یونان کے ایک چھوٹے سے جزیرے ”کلستیلوریزو“ میں ہائیڈرو کاربن کی تلاش کر رہا تھا، بارہا اس کا یونان کے بحری ادارے کے حکام سے تنازع ہوا۔ یاد رہے یونان اور ترکی کی آپس میں دیرینہ مخاصمت ہے اور دونوں کے درمیان بحیرۂ روم کی بحری سرحدوں پر کشیدگی رہتی ہے۔

جب کبھی یونان اور ترکی اس مسئلے پر تنازع کا شکار ہوتے ہیں، اس کی شدت کو کم کرنے کے لیے ثالثی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ درحقیقت ”کیستیلو ریزو تنازع“ ترکی کے جارحانہ عزائم، غلبے کی جنگ اور برسوں پر محیط چپقلش کا شاخسانہ ہے۔ اس دیرینہ لڑائی میں شدت آنے کی بنیادی وجہ ترکی کا اپنی محتاط اور محاذ آرائی سے گریز پالیسی سے انحراف ہے۔

بحیرہ روم میں رونما ہونے والے کسی بھی واقعے کو خطے کی مجموعی حرکیات سے الگ نہیں دیکھا جاسکتا۔ یہ خطہ ہمیشہ سے عالمی سیاست کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ امریکا کی مسلط کردہ عراق جنگ کے بعد اس خطے کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا، جس کے نتیجے میں امریکا کو اپنی خارجہ پالیسی کی ترجیحات کو ازسرنو ترتیب دینا پڑا۔ اس کی کوشش ہے کہ دوسری طاقتوں کو اپنے مخصوص ایجنڈے کی تکمیل کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس طرح امریکا اپنے اثر ورسوخ کو زیادہ بہتر انداز سے استعمال کر رہا ہے۔

اس پورے منظرنامے میں ترکی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بڑے تندہی سے کام کر رہا ہے، اس کی کوشش ہے اپنے ایجنڈے کو زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکے۔ ترکی امریکا کی خواہشات کے برخلاف اب ان کوششوں کو تقویت دینے کے لیے اسلامک پاپولرازم، نیشنل ازم اور اپنی بالادستی کو فروغ دے رہا ہے۔ ایک وقت تھا امریکا ترکی کی آزادانہ معیشت، مغرب نواز پالیسی کو عرب ممالک کے لیے بطور مثال پیش کرتا تھا۔ تاہم، انقرہ مغرب کو یکسر نظر انداز کیے بغیر اپنے مفادات اور لبرل ازم کو برقرار رکھتے ہوئے مغرب سے تجارتی اور دفاعی تعلقات بھی استوار کیے ہوئے ہے۔

۲۰۱۵ء سے طیب ایردوان اپنی ”تاریخ کی بازیافت“ کے لیے غیر معمولی اقدامات کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس طرح وہ مشرقی یورپ، مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا میں اپنے اثر ونفوذ میں اضافے کو اپنی روحانی سرحدوں اور اپنے جغرافیہ کی بحالی اور واپسی جیسے خوشنما نعروں سے تعبیر کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقتاً یہ اپنے ماضی اور سلطنت عثمانیہ کو دوبارہ حاصل کرنے کی خواہش ہی ہے جس کے نتیجے میں ایردوان کی قیادت میں جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی یہ سارے اقدامات کر رہی ہے۔

ترکی ایک عالمی طاقت بننے کا خواہش مند ہے تاکہ وہ برابری کی بنیاد پر دوسری طاقتوں سے بات کرسکے اور جہاں ممکن ہو اپنی بات منوا سکے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ترکی اپنی دفاعی صلاحیتوں میں اضافے کے لیے سرمایہ لگا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیا کے سامنے اپنا مثبت چہرہ پیش کرنے کے لیے معیشت، مذہب اور تفریحی و ثقافتی سرگرمیوں میں بھی سرمایہ لگا رہا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ایردوان کے مقاصد دفاع اور استحکام سے زیادہ جغرافیائی سیاسی حرکیات کو ترکی کے لیے زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا ہے۔ ترکی اس وقت نظریاتی تبدیلی کی جانب گامزن ہے۔ ترکی نے عراق اور شام میں اپنے مقاصد کے لیے فوجی مداخلت سے بھی گریز نہیں کیا۔ اسی طرح یونان اور قبرص کے ساتھ بحری سرحدوں اور کچھ اہم علاقوں کے حصول کے لیے سیاسی اثر ورسوخ اور طاقت کا استعمال کر رہا ہے۔ ترکی نے صومالیہ، قطر، لیبیا، نگورنو کاراباخ، شمالی شام اور شمالی قبرص میں بھی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی تزویراتی موجودگی کو برقرار رکھا ہوا ہے۔

Milli Gorus کے نظریات میں یہ بات شامل ہے کہ مغرب کے ساتھ محاذ آرائی رکھنا ہے۔

ترکی اپنے خود ساختہ اسلامی نظریات جو اسے ۱۹۷۰ء میں ابھرنے والی تحریک (ملی گورس) سے ورثے میں ملے ہیں اس کو کو مسلط کرنے کے درپے ہے۔ ایردوان اسی جماعت کی حمایت سے استنبول کے میئر بنے تھے۔ ۲۰۰۱ء میں ایردوان کے نظریات سے کچھ مختلف تھے۔ ایردوان یورپی یونین میں شامل ہونے کے خواہش مند جب کہ اربکان اسلامی ممالک کے ساتھ تعلقات استوار رکھنا چاہتے تھے۔ ابتدا میں اربکان کی جماعت کو اس حوالے سے خاصی تنقید کا بھی سامنا رہا۔ ۲۰۱۵ء میں ایردوان نے ایک اتحاد بنایا جس نے کردش مزاحمت کاروں اور قبرص کے حوالے سے سخت مؤقف کو اپنایا۔

ترکی کی نظر اس وقت ۱۹۲۳ء کے ”لوزان معاہدے“ پر ہے، جس پر وہ کبھی دلی طور پر آمادہ نہیں تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مصطفیٰ کمال اتاترک نے معاہدہ لوزان کو اہم فتح قرار دیا تھا۔ لیکن اربکان اور اس کے حامی اس کو غداری سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایردوان معاہدہ لوزان پر نظر ثانی پر زور دیتے رہے ہیں۔

ایردوان کے نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بحیرہ روم کا موجودہ تنازع محض معدنی گیس کی جنگ نہیں بلکہ کئی دہائیوں سے جاری طاقت کے حصول کی کوششوں کا حصہ ہے۔ (ترجمہ: محمود الحق صدیقی)

"What Erdogan really wants in the Eastern mediterranean". ("Foreign Policy". Jan.19,2021)

بقیہ: میانمار کو تنہا نہیں کرنا چاہیے!

صورتحال میں بہتری کے لیے بائیڈن کے پاس فوج کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں، فوج پر اثر انداز ہو کر ہی جمہوریت کے لیے راستہ نکالا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی امریکی پالیسی ساز میانمار کے حوالے سے اپنی سب سے بڑی کمزوری فوج سے تعلقات نہ ہونے کو قرار دے چکے ہیں۔ امریکا کو میانمار کو دوبارہ اتحادی سے اچھوت میں تبدیل نہیں کرنا چاہیے۔ (ترجمہ: سید طالوت اختر)

"Don’t isolate Myanmar".
("project-syndicate.org". Feb 5, 2021)

بقیہ: میانمار میں کیا ہوا؟

ہدایت کی گئی۔ سابق سویلین حکومت سے وابستہ ایک شخصیت نے بتایا کہ اس رات ٹیلی کمیونی کیشن کمپنیوں کے دفاتر اور تنصیبات میں فوجی آئے اور تین بجے تک نصف سے زائد کمپنیوں کی انٹرنیٹ کنیکٹیویٹی ختم ہوچکی تھی۔ میانمار کی چار میں سے کسی بھی ٹیلی کمیونی کیشن کمپنی نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

سویلین حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے میانمار کے اعداد کے اثرات پر غیر معمولی اعتقاد رکھنے والے جرنیلوں نے وقت اور دن کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔ میانمار میں ۹ کا ہندسہ نیک شگون کے طور پر لیا جاتا ہے۔ یہ اقدام یکم فروری کو رات کے تین بجے کیا گیا۔ تاریخ تھی ۲۱-۱-۲ اور وقت تھا ۳ بجے۔ ان ہندسوں کا مجموعہ ۹ بنتا ہے۔

"Suu Kyi destroyed phone after fraught talks".
("straitstimes.com". Feb.11, 2021)

میانمار کو تنہا نہیں کرنا چاہیے!

Brahma Chellaney

فوج ہمیشہ ہی میانمار (برما) میں اقتدار پر قبضہ کرتی رہی ہے۔ میانمار میں فوج نے ایک بار پھر عشرے سے جاری جمہوری عمل کی بساط لپیٹ کر سیاسی رہنماؤں کو نظر بند کردیا ہے۔ جس کے بعد میانمار کو سزا دینے کے لیے پابندیاں عائد کرنے اور عالمی تنہائی میں دھکیلنے کے مغربی مطالبات زور پکڑتے جارہے ہیں۔ اس طرح کا کوئی بھی اقدام غلط ہوگا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے تمام ممالک تھائی لینڈ، لاؤس، کمبوڈیا، ویتنام اور میانمار اپنے شمالی پڑوسی ملک چین کی طرح آمرانہ طرزِ حکمرانی رکھتے ہیں۔ میانمار میں جمہوری عمل کی ناکامی ایک بار پھر یاد دلاتی ہے کہ انتہائی طاقتور آمرانہ قیادت اور اداروں کی موجودگی میں جمہوریت کا پنپنا ناممکن ہے۔ جمہوری ممالک کی جانب سے سزا کی قیمت میانمار معاشی بدحالی کی شکل میں ادا کرے گا۔ ملک میں سول سوسائٹی کمزور ہوجائے گی اور جمہوری طاقتوں کے ساتھ قریبی تعلقات خراب ہوں گے۔ لیکن ماضی کی طرح پابندیوں کا خمیازہ عام شہری بھگتیں گے اور جرنیلوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ ایک حقیقت پسندانہ منظرنامہ ہے۔ امریکی صدر جو بائیڈن نے متنبہ کیا ہے کہ فوجی بغاوت کے بعد پابندیوں کے قوانین کا فوری جائزہ لے کر مناسب کارروائی کی جائے گی۔ لیکن بائیڈن اس بات پر غور کرنا چاہیں گے کہ ماضی میں امریکا کی زیر قیادت پابندیوں نے میانمار کو چین کی اسٹریٹجک گود میں دھکیل دیا، جس سے علاقائی سلامتی کے چیلنجوں میں اضافہ ہوا۔ پابندیاں ایک انتہائی سخت اقدام ہوگا۔ تھائی لینڈ کے آرمی چیف ایک غیر مقبول ہوتے بادشاہ کی حمایت کے ساتھ ۲۰۱۴ء سے برسر اقتدار ہیں، وہ بظاہر ایک سول حکمران کا روپ اختیار کیے ہوئے ہیں اور امریکا تھائی لینڈ کے ساتھ تجارت بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔ تھائی لینڈ میں جمہوریت کے حامی مظاہرین کے خلاف کریک ڈاؤن مسلسل جاری ہے اور شاہی خاندان کی توہین پر قید کی سزا کے سخت قوانین موجود ہیں تو پھر اس کے پڑوسی ملک میانمار کے لیے معیار دہرا کیوں ہے۔ اسی طرح امریکا، بھارت، جاپان اور دیگر نے کمیونسٹ پارٹی کے زیر اقتدار ویتنام کے ساتھ قریبی دفاعی تعلقات استوار کیے ہوئے ہیں۔ درحقیقت امریکا حالیہ برسوں میں بڑے فخر کے ساتھ ویتنام کے ساتھ مضبوط سکیورٹی تعلقات کے بارے میں بتاتا رہا ہے۔ میانمار کے جرنیلوں کے ساتھ رابطے اور تعاون ہی جمہوری ممالک کو ایک اسٹریٹجک اہمیت کے حامل ملک پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت فراہم کرسکتا ہے۔

گزشتہ دہائی میں جیسے ہی میانمار میں جمہوری عمل کا آغاز ہوا، مغرب نے اس عمل کے پیچھے موجود قوت یعنی فوج کے ساتھ قریبی تعلقات استوار کرنے کو نظر انداز کردیا۔ مغرب نے آنگ سانگ سوچی پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے جمہوریت کی بحالی کا سہرا بھی ان کو ہی دے دیا۔ مغرب کا فوج کو نظر انداز کرنا اس وقت بھی جاری رہا جب سوچی نے روہنگیا مسلمانوں کے معاملے پر فوج کا دفاع کیا۔ بہت سارے روہنگیا مسلمان وحشیانہ فوجی مہم کے نتیجے میں بنگلا دیش فرار ہوگئے۔ مغرب کے اس رویے نے میانمار کی فوج کو اکسایا اور رواں ماہ بغاوت ہوگئی۔ آج میانمار کی فوج پر امریکا کا بہت کم اثر ہے۔ روہنگیا مسلمانوں کو ملک بدر کرنے کے الزام میں بغاوت کی قیادت کرنے والے جنرل من آنگ ہیلی ینگ اور ان کے نائب جنرل سوون پر ۱۴ ماہ قبل امریکی پابندیاں عائد کی جاچکی ہیں۔ لیکن سنکیانگ میں مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر نسل کشی کے باوجود امریکا نے چین کے اعلیٰ فوجی حکام اور پارٹی قیادت کے بجائے نچلے درجے کے اہلکاروں کو ہی صرف دکھانے کے لیے پابندیوں کا نشانہ بنایا۔ غیر مؤثر ہونے اور غیر متوقع نتائج کے باوجود پابندیاں مغربی سفارتکاری کا خاصہ رہی ہیں، چھوٹی اور کمزور ریاستوں سے نمٹنے کے لیے پابندیوں کا استعمال بھی بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس غیر مغربی جمہوریتیں تعمیری رابطہ کاری کو ترجیح دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر جاپان نے میانمار کی فوج کے ساتھ شراکت کا پروگرام جاری رکھا ہے، جس میں استعداد کار بڑھانے کے لیے تربیت کا عمل شامل ہے۔ اسی طرح میانمار اور بھارت کے دفاعی تعلقات کافی بہتر ہوگئے ہیں، دونوں مشترکہ مشقیں اور فوجی تعاون کرتے ہیں، حال ہی میں بھارت نے اپنے پڑوسی ملک کو پہلی آبدوز فراہم کی ہے۔ اس طرح کے تعلقات سے چینی اسلحے کی فراہمی کا مقابلہ کرنے کے ساتھ بھارت کے خلاف لڑنے والے شمالی میانمار میں پناہ گزین باغیوں کے خلاف بھی کارروائی میں مدد ملتی ہے۔ بات چیت اور رابطہ کاری کے بغیر پابندیاں ہمیشہ لاحاصل رہی ہیں، ۲۰۱۰ء میں امریکا میانمار پر پابندیاں لگانے کا سوچ رہا تھا تو اس وقت کے صدر براک اوباما نے بھارت کے میانمار کے ساتھ تعمیری تعلقات پر تنقید کی تھی۔ لیکن کچھ مہینوں کے اندر ہی اوباما نے بھارت کی حکمت عملی اپنائی اور اس کے نتیجے میں ۲۰۱۲ء میں امریکی صدر نے میانمار کا تاریخی دورہ کیا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر سے امریکی پابندیوں کے نتیجے میں چین کو میانمار کا سب سے بڑا تجارتی شراکت دار بننے میں مدد ملی۔ لیکن ۲۰۱۱ء میں جمہوریت کی بحالی کے ساتھ ہی میانمار نے بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے متنازع اور اہم چینی منصوبے مائیٹسون ڈیم کو معطل کردیا۔ جس سے میانمار کا چین پر انحصار کم کرنے میں مدد ملی اور اس کی خارجہ پالیسی متوازن ہوگئی جبکہ اندرون ملک اصلاحات کو بھی فروغ ملا۔ آج میانمار کو دنیا سے الگ تھلگ کرنے کی امریکی کوششوں سے زیادہ چین کے لیے فائدہ کی کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ میانمار چین کے لیے بحر ہند میں ایک اسٹریٹجک گیٹ وے ہے اور قدرتی وسائل کی فراہمی کی اہم گزرگاہ ہے۔ درحقیقت پابندیوں اور تنہائی کے نتیجے میں میانمار لاؤس، کمبوڈیا اور پاکستان جیسے دوسرے چین کے زیر اثر ممالک میں تبدیل ہوجائے گا۔ جیسا کہ جاپان کے وزیر مملکت برائے دفاع نے متنبہ کیا ہے کہ پابندیوں کے نتیجے میں پورے خطے کی سلامتی داؤ پر لگ جائے گی۔ امریکی پالیسی سازوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ دوسرے ممالک کے خلاف امریکی پابندیوں نے چین کے فائدے میں کتنی بار کام کیا ہے۔ انہیں فکرمند ہونا چاہیے کہ کس طرح پابندیوں نے روس کو چین کے قریب کردیا اور دو فطری حریف ممالک قریبی اسٹریٹجک شراکت دار بننے پر مجبور ہوگئے۔ اسی طرح ایران کے خلاف امریکی پابندیوں کے نتیجے میں سب سے زیادہ تجارتی فائدہ اٹھانے والا ملک چین ہے۔ اسی لیے اب امریکا کو میانمار کے معاملے میں ایک تعمیری پالیسی اپنانے کی ضرورت ہے۔ جب بائیڈن نے باہمی دلچسپی کے شعبے میں دنیا کی سب سے بڑی آمریت چین کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا ہے تو امریکا کو کم از کم ایک انتہائی کمزور ملک میانمار کے ساتھ بھی اسی طرح کی روش اپنانی چاہیے، جہاں فوج واحد کام کرنے والا ادارہ ہے۔ میانمار کی موجودہ

باقی صفحہ نمبر ۴

نائیجیریا، پولیس کے خلاف نوجوانوں کی تحریک

Saratu Abiola

نائیجیریا ایک ایسی ریاست ہے جو سانس لے رہی ہے، اگر چہ کہ ماسک کی وجہ سے اسے سانس لینے میں مشکل کا سامنا ہے۔ ۷؍اکتوبر کو رشوت کے خلاف بنائی جانے والی بدنام زمانہ خصوصی فورس کی ایک ویڈیو انٹرنیٹ پر پھیل گئی، ڈیلٹا ریاست کے شہر اوغلی میں بنائی گئی اس ویڈیو میں خصوصی فورس کا ایک اہلکار ایک شہری کو ہلاک کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے شہری کو گولی مارنے کے بعد وہ شخص اپنے گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا جاتا ہے۔ اس واقع نے سیکڑوں نائیجیرین کو اپنے ساتھ پیش آنے والے برے واقعات بیان کرنے کی ہمت دلادی، جو ماضی میں بدنام خصوصی فورس کی وجہ سے ان کے ساتھ پیش آئے، ان واقعات میں ان کے قریبی عزیز اور ساتھیوں کا قتل، غیر قانونی گرفتاری سمیت بھتہ خوری جیسے جرائم شامل تھے اس واقعے سے شروع ہونے والا احتجاج پورے نائیجیریا میں پھیل گیا۔

نائیجیریا میں پولیس کی بربریت ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ۲۰۰۴ء سے اب تک ماورائے عدالت قتل نے ایک ریکارڈ قائم کرلیا ہے، اس عرصے میں ۳۰،۰۰۰ نائیجیرین اس خصوصی فورس کے ہاتھوں قتل کردیے گئے یہ وہ تعداد ہے جو کہ رپورٹ ہوگئی۔ ایک بڑی تعداد جو کہ نامعلوم ہے وہ ان شہریوں کی ہے جو پولیس کے ہاتھوں غیر قانونی طور پر مار کر غائب کردیے گئے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ۲۰۰۹ء کی رپورٹ اور ہیومن رائٹس کی رپورٹ اس بات کی شاہد ہیں کہ نائیجیریا کے نوجوان پچھلے برسوں میں ”سارس فورس“ کے ہاتھوں بھتہ خوری اور تشدد کا شکار ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے پہلا ہیش ٹیگ ”اینڈ سارس“ کے نام سے ۲۰۱۷ء میں ٹرینڈ پر تھا اس ہیش ٹیگ نے ملک بھر میں مقبولیت حاصل کی۔

نائیجیریا عوام کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ پولیس کی بربریت اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ہے، اور اسی وجہ سے یہ سب متحد ہوکر احتجاج میں شریک ہیں۔ مظاہرین نے مطالبات کی پہلی فہرست جاری کی ہے اس میں گرفتار لوگوں کی رہائی، پولیس کی تنخواہوں میں رشوت اور بدعنوانی سے نمٹنے کے لیے اضافہ اور پولیس تشدد کی باضابطہ تحقیقات شامل ہیں۔ نائیجیریا میں یہ پہلا موقع ہے جب حکومت اور عوام کے درمیان بات چیت کا ماحول بنا ہے، ایسی صورتحال میں مظاہروں کے ساتھ ساتھ مظاہرین اور ان کے مطالبات میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے لیکن اہم مطالبات وہی ہیں جو پہلی فہرست میں جاری کیے گئے ہیں۔

یہ تمام مظاہرے طاقتور نوجوان مظاہرین کی قیادت میں کیے جارہے ہیں، مظاہروں کا ایک سبب یونیورسٹی اسٹاف کی طرف سے کی گئی ہڑتال بھی ہے جس کا آغاز مارچ میں ہوا تھا۔ ریاست کے نوجوان شہری گھروں میں پھنس کے رہ گئے ان میں اکثریت اپنے اساتذہ اور لیکچرار سے متاثر تھے۔ کووڈ۱۹ کی وجہ سے نائیجیریا کے نوجوان ملک سے کہیں باہر سفر نہیں کرسکتے تھے اس لیے وہ ملک کے اندر موجود مظاہروں میں بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور مختلف طبقوں کے نوجوان سوشل میڈیا کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ آتے چلے گئے، ان نوجوانوں نے چھوٹے چھوٹے احتجاجی مظاہرے شروع کیے جن میں جنسی ہراسگی کے خلاف مارکیٹ مارچ، ابوجا ماحولیاتی تحفظ بورڈ کے ذریعے خواتین کو سڑکوں پر ہراساں کرنے کے خلاف مارچ اور اس سے پہلے ”اینڈ سارس“ کے خلاف احتجاج شامل ہیں، اس کے بعد حکومت نے سارس کے خلاف ایکشن کی یقین دہانی کرائی تھی جو کہ حسب معمول پوری نہیں کی جاسکی۔ ۲۰۱۷ء سے ۲۰۱۹ء کی احتجاجی سرگرمیوں نے یہ واضح کیا ہے کہ کس طرح نائیجیرین نوجوان سوشل میڈیا کے جدید طریقوں سے تیزی سے ہم آہنگ ہورہے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ملک کے دو بڑے حصے طاقتور مسلم شمالی علاقہ اور متنوع مذاہب پر مشتمل جنوب کے علاقوں کے مابین نسلی، مذہبی سیاسی شکوک و شبہات میں بھی تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔

مظاہرین کے اعتدال پسند مطالبات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ماضی کی تمام حکومتیں ملک میں اصلاحات کے لیے قومی سطح پر مذاکرات کرنے میں ناکام ہوگئیں یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام سے غربت اور کرپشن کو دور کرنے کے کیے گئے وعدے حکومتیں پورا نہیں کرسکیں۔ ماضی کی کوششیں جیسے سروس اصلاحات اور عدلیہ کی اصلاحات سیاسی فائدے کے لیے کی گئیں، بڑے قومی مسائل کے حل کے لیے جو اصلاحات کی گئیں وہ بھی سیاسی فائدے اور طاقت کے لیے ہی کی گئیں، پولیس کی اصلاحات کی کہانی جو کئی برسوں سنائی جارہی ہے وہ بھی فقط ایک حسین خواب بن کر رہ گئی ہے، ان تمام بڑے قومی مسائل پر حکومتی نااہلی نے عوام کے اعتماد کو مجروح کیا ہے۔

ماضی میں حکومت کی بدترین کارکردگی کی وجہ سے مظاہرین اپنے پیغامات بہت سادہ رکھے ہیں۔ ”ہماری لڑکیاں واپس لاؤ“ پیغام کو عام کرنے کی مہم ان ۲۷۶؍اسکول کی لڑکیوں کے لیے ہے جنہیں بوکوحرام نے اغوا کیا، اسی طرح ”اینڈ سارس“ دوحرفی اور سادہ پیغام ہے سادہ اور دوٹوک پیغامات دراصل ایک اہم قدم ہیں جس کے ذریعے ساری توجہ نائیجیریا کے عوام کو قومی مسائل کے حل کے لیے اکٹھے کرنے پر دی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر ”ہماری لڑکیاں واپس کرو“ پیغام میں احتجاج کے راہنما اوبے ازیکوسلی کی ساری توجہ اس آرمی پر ہے کہ کسی بھی طریقے سے اغوا کی گئی نائیجیرین لڑکیاں جلد از جلد گھروں کو واپس لائی جائیں۔ دونوں پیغامات کو اسی طریقے سے ترتیب دیا گیا ہے کہ اگر کسی کو سیاسی معاملات کا علم نہ بھی ہو تو وہ بھی پیغامات کو واضح طور پر سمجھ سکے اس کے علاوہ دنیا بھی میں پھیلے نائیجیرین تک اپنی بات پہنچا رہے ہیں تاکہ بین الاقوامی برادری کے معروف لوگ اور بڑے ممالک نائیجیریا کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔

”اینڈ سارس“ پیغام بھی واضح پیغام تھا جو کہ ٹھیک وقت کے مطابق مسائل کی ترجمانی کررہا تھا جبکہ ”ہماری لڑکیاں واپس لاؤ“ پیغام مناسب وقت پر سامنے نہیں آیا اس لیے وہ اثر انداز نہیں ہوا، یہ پیغام ۲۰۱۴ء میں سامنے آیا جس وقت عام انتخابات قریب تھے اس پیغام میں اس وقت تفرقہ انگیزی کی گئی جو کہ ریاست کے شمال مشرقی حصے کے مسلم باغیوں کو شکست دینے کے لیے تھی لیکن ”اینڈ سارس“ پیغام کو نائیجیریا کی حکومت پھیلنے سے نہیں روک سکی، نہ ہی وہ اس کو سیاسی رنگ دے سکی۔ جب حکومت نے اسے سیاسی رنگ دے کر ملک کو غیر مستحکم کرنے کا الزام لگایا تو وہ اس الزام کو ثابت کرنے میں بُری طرح ناکام رہی، حکومت پولیس کی بربریت کو کوئی جواز نہ دے سکی نہ ہی وہ عوام کے غضب سے پولیس کو بچاسکی اور اس لیے وہ اسے سیاسی رنگ نہ دے سکی۔

سادہ پیغامات اور مطالبات کا یہ سال نوجوانوں کے لیے امید کا سال ہے، نوجوانوں کے مطابق ان کے مطالبات بنیادی ہیں جو حکومت کے لیے آسان ہے اور حکومت انہیں سنے گی۔ یہ امید اس بات کی علامت ہے کہ نوجوانوں نے ماضی کی تخریب کارنسل سے کچھ نہیں سیکھا۔ ۲۰؍اکتوبر سے حکومت نے احتجاج

کو دبانا اور مظاہرین کو منتشر کرنا شروع کر دیا ہے، صدر بخاری کا کہنا ہے کہ حکومت تخریب کاروں کو کھلی چھوٹ نہیں دے گی، قومی کونسل نے اب مزید احتجاج کی اجازت دینے سے بھی منع کر دیا ہے۔ نائیجیریا کے عوام برطانیہ کی طرف سے لگائی جانے والی ممکنہ پابندیوں پر بات کر رہی ہے جو کہ نہتے عوام پر تشدد کے خلاف لگائی جا رہی ہیں ساتھ میں یہ مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے کہ بین الاقوامی برادری نائیجیریا کی فوج پر رپورٹ بنائے اور عدلیہ کا پینل ملک میں ہونے والے خوفناک واقعات کے صحیح اعداد و شمار جمع کرے اور احتجاج کے دوران ہونے والے تشدد کی چھان بین کرے۔ یہ ابھی واضح نہیں کہ مزید احتجاج اگلے مہینے جاری رہ سکیں گے یا نہیں لیکن یہ واضح ہے کہ نائیجیریا کی حکومت ان سادہ پیغامات اور مطالبات کے خلاف بھی مزاحمت کرتی رہے گی۔

(ترجمہ: سمیہ اختر)

"Nigeria police protests: How the youth mobilised across a divided country".
("ecfr.eu". December 9, 2020)

عارف نقوی: ’’کیا زبردست شخصیت ہے!‘‘

عتیقہ رحمٰن

عارف نقوی پاکستان کی تاریخ کا وہ کردار ہے جس نے کمال ہنرمندی سے اپنی صلاحیت اور دولت کا استعمال کیا۔ وہ ہر حکومت کی آنکھ کا تارا بنے۔ وہ پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن)، متحدہ قومی موومنٹ اور پاکستان تحریک انصاف کے رہنماؤں کو بیک وقت ڈیل کرنے اور تعاون کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ کراچی الیکٹرک کمپنی کی نجکاری کی آج تک کسی کو سمجھ نہ آسکی۔ یہ صرف عارف نقوی اور حکمران ٹولہ جانتا ہے کہ کراچی کے اہم اثاثے ”کے الیکٹرک“ کو کیسے لُوٹا گیا۔

عارف نقوی کی درج بالا داستان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مفاد پرستی اور دولت کی ہوس کے باوجود جب قدرت کی لاٹھی کسی پر برستی ہے تو وزیراعظم سمیت کوئی بھی مفاد یافتہ سیاستدان یا ادارہ اُس کی مدد کو نہیں آتا۔ شاید عارف نقوی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ عارف نقوی کے امریکا اور چین کے مفادات کے درمیان سینڈوچ بن جانے پر پاکستان کے حکمران اور ادارے یہ طے نہیں کرپائے کہ انہیں چین کا ساتھ دینا ہے یا امریکا کا؟ اب دیکھنا یہ ہے کہ عارف نقوی امریکا منتقل ہونے کے بعد کس کس کو امریکی عدالتوں میں بے نقاب کرتے ہیں؟ امریکیوں سے کیا ڈیل کرتے ہیں؟ پاکستان کو امریکا سے بے وفائی کی کیا سزا دلواتے ہیں؟ یا سرخرو ہو کر واپس آتے ہیں، جس کا کم ہی امکان ہے۔

جیسے ہی جج نے ملزم کو آگاہ کیا کہ وہ اپنا دوسرے ملک کو حوالگی کا مقدمہ ہار گیا ہے تو ملزم ایک لمحے کے لیے فرش کو گھور کر رہ گیا۔ یہ ملزم کوئی اور نہیں بلکہ طاقتور ترین اَبراج گروپ کے بانی عارف نقوی تھے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس خبر کا اُن پر کیا اثر ہوا ہوگا کہ اب انہیں امریکا کے حوالے کر دیا جائے گا، جہاں ساٹھ سالہ عارف نقوی کو اپنے خلاف الزامات ثابت ہونے پر باقی زندگی زنداں کی سلاخوں کے پیچھے گزارنی پڑ سکتی ہے۔ کورونا کے ہنگام چہرے پر ماسک چڑھائے عارف نقوی اس مختصر عدالتی کارروائی کے دوران میں بیشتر وقت خاموش ہی رہے۔ اپنے خلاف آنے والے فیصلے کے باوجود آخر میں انہوں نے ہاتھ بلند کر کے جج کا شکریہ ادا کیا۔

ہم کمرۂ عدالت سے باہر آنے لگے تو ایک صحافی نے تبصرہ کیا ’’کیا زبردست شخصیت ہے!‘‘ ۲۰۱۸ء میں اَبراج گروپ کے ٹوٹنے سے پہلے میڈیا سے وابستہ جتنے افراد عارف نقوی کو جانتے ہیں وہ انہیں ایسے ہی الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صحت اور تعلیم سے وابستہ ابھرتی مارکیٹ میں انہوں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ کر خود کو ہیرو ثابت کر دیا تھا۔ دورِ عروج میں اَبراج گروپ کے پاس ۱۳ بلین ڈالر کی سرمایہ کاری تھی اور اس کے پیچھے ایک ہی شخص تھا: عارف نقوی۔

۲۰۱۷ء میں اَبراج گروپ کی قسمت کا ستارہ غروب ہونے لگا۔ اس مقام پر نقوی کی المیہ کہانی یونانی اساطیری داستان ’’اکاروس‘‘ سے مشابہ ہونے لگی۔ جب اکاروس کو اس کے کاریگر والد نے مصنوعی پَر لگا دیے تھے کہ ان کے ذریعے وہ پرواز کر سکے۔

۲۰۱۷ء میں کسی مخبر نے سرمایہ کاری کرنے والوں کو بذریعہ ای میل کمپنی کے اسکینڈل اور کمپنی کے اچانک ٹوٹنے کے بارے میں خبردار کر دیا۔ اس نے سرمایہ کاروں کو یہ بھی آگاہ کیا کہ کمپنی سرمایے کے بارے میں مبالغے سے کام لے رہی ہے۔ نیز مخبر نے فنڈ کے حسابات اور منافع میں بے ضابطگیوں کے الزامات بھی عائد کیے۔ اس دوران ایسی افواہیں گردش کرنے لگیں کہ کمپنی کے پاس سرمایہ ختم ہو چکا ہے اور کمپنی صحت سے متعلقہ فنڈ کے غلط استعمال سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ سرمایہ کاروں کا اعتماد متزلزل ہوگیا اور انہوں نے اپنے سرمایے کی واپسی کے تقاضے شروع کر دیے۔ ۲۰۱۸ء میں اَبراج گروپ نے ایک بلین ڈالر کے قرضہ جات کی بے باقی کے لیے کاروبار کے اختتام کا اعلان کر دیا۔

اپریل ۲۰۱۹ء میں عارف نقوی کو ہیتھرو ایئرپورٹ پر گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر امریکا میں مالی بے ضابطگیوں اور منی لانڈرنگ جیسے الزامات تھے۔ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے مسلسل کام کرتے ہوئے طیارے پر رہنے والے عارف نقوی کی آج کی زندگی ماضی میں گزری شاندار زندگی سے قطعاً اُلٹ ہے۔ ۱۵ ملین ڈالر کی ضمانت کے بعد ساری جائیداد فروخت کرنے کے بعد آج وہ جنوبی کنسنگٹن کے اپنے اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں جو اس وقت ان کی بچ جانے والی واحد جائیداد ہے۔ وہ کیمروں کی مسلسل نگرانی میں رہتے ہیں اور انہیں محض دو گھنٹے چہل قدمی کی اجازت ملتی ہے۔ اس گھر کو بعض اوقات پُرتعیش رہائش گاہ قرار دیا جاتا تھا جو عارف نقوی کے لیے اب محض ایک قید خانہ بن کر رہ گیا ہے۔

گزشتہ دو سالوں سے نقوی صاحب زندگی کے اس نشیب و فراز پر غور کر رہے ہیں۔ یہ ڈرامائی زوال بہت سے سوال اٹھاتا ہے: کیا نقوی کا کردار یونانی داستان کے کردار ’’اکاروس‘‘ سے مشابہ ہے؟ جس میں زوال سے پہلے تکبر اور فخر کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ کامیابیوں کے باوجود کیا اس کا بلندی کی سمت سفر گہنا گیا ہے؟ حوالگی کے کیس میں جج ایما اربتھناٹ نے عارف نقوی کے بارے میں دو ماہرین نفسیات کی طرف سے پیش کی گئی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں ماہرین نفسیات کی رپورٹ کو اہم سمجھتی ہوں کہ عارف نقوی خودکشی کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ایک ماہر نفسیات کے مطابق عارف نقوی ماضی کی یادوں کی طرف واپس جانے کی شدید تڑپ رکھتے ہیں، یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ان میں اب زندہ نہ رہنے کی آرزو پیدا ہو رہی ہے۔ نفسیاتی اور مالی لحاظ سے وہ شدید کرب سے گزر رہے ہیں۔

فیصلے میں اور بھی دردناک تفصیلات شامل تھیں۔ جون ۲۰۱۹ء میں چار ہفتوں میں نقوی کا وزن دس کلوگرام کم ہوگیا۔ جون ۲۰۲۰ء میں امریکی حکومت کی طرف سے متعین ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر کمنگز کا کہنا تھا کہ جب نقوی سے پوچھا گیا کہ اگر انہیں حکومت کی تحویل میں دیا گیا تو وہ کیا کریں گے؟ اس سوال کا جواب عارف نقوی نے اس طرح دیا کہ وہ اپنے خاندان والوں کو کبھی یہ نہیں سوچنے دیں گے کہ عارف نقوی کے پاس قانونی لڑائی کے لیے پیسے تھے اور نہ دیگر ذرائع۔ جب نقوی سے مزید پوچھا گیا تو انہوں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ پچھلے مہینے ڈاکٹر کمنگز اور دفاع کے لیے تعینات ماہر نفسیات ڈاکٹر فیلن کو معلوم ہوا کہ عارف نقوی کی صحت بگڑ گئی ہے۔ انہوں نے نقوی میں نفسیاتی علامات کے ساتھ ساتھ شدید مایوسی کی موجودگی کی بھی نشان دہی کی اور اس حالت کا جج نے بھی اعتراف کیا۔ تاہم آخر میں جسٹس اربتھ ناٹ نے ان کی امریکا کو حوالگی کی اجازت دے دی۔

عارف نقوی کسی غیر قانونی کام سے انکار کرتے ہیں مگر ان کی طرف سے الزامات کو مسترد کرنا تبھی سامنے آئے گا جب ان پر مقدمے کی کارروائی (ٹرائل) شروع ہوگی۔ امریکی ڈسٹرکٹ کورٹ میں پیش کی جانے والی چارج شیٹ ابراج گروپ کی مبینہ غلط کاریوں کا ڈرامائی بیان ہے۔

اب تک کی صورتحال یہ ہے کہ عارف نقوی پہلا معرکہ ہار چکے ہیں۔ ان کی پیدائش اور ورثے کی جگہ ”پاکستان“ میں عارف نقوی کے مقدمے نے ملے جلے ردعمل کو ابھارا ہے۔ کچھ لوگوں کو اس بات پر خوشی ہے کہ امریکی مقدمہ عارف نقوی کے پاکستانی سیاسی اشرافیہ کے ساتھ مراسم سے پردہ اٹھادے گا۔ بعض لوگ اس بات پر افسوس کا اظہار کررہے ہیں کہ عارف نقوی کی داغ دار میراث ان پاکستانی کاروباری حضرات کے مستقبل پر بُرے اثرات مرتب کرے گی جو دنیا بھر میں اپنا مستقبل بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں کہ ابراج گروپ کے لیے یہ ناکامی سب سے مہلک ثابت ہوئی، جب وہ K-Electric کمپنی میں اپنے ۶۶ فیصد حصص شنگھائی الیکٹرک پاور کمپنی کو فروخت کرنے میں ناکام رہے، جن کی فروخت سے ۱۷۵۰ ملین امریکی ڈالر مل سکتے تھے۔

پاکستان کے سابق وزیراعظم شاہد خاقان عباسی ان بہت سارے اسٹیک ہولڈرز میں سے ایک تھے، جو ابراج گروپ کی کمپنی کراچی الیکٹرک کی شنگھائی الیکٹرک کمپنی کے ہاتھوں فروخت کو گہری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ سابق وزیراعظم کا کہنا تھا کہ اگر ابراج گروپ کو اس بات کی اجازت مل جاتی کہ وہ کراچی الیکٹرک کمپنی میں اپنے حصص شنگھائی الیکٹرک کمپنی کو فروخت کردیں تو عارف نقوی آج آزاد ہوتے۔

آپ مجھے بتائیں ایک ایسا انسان جس کے پورے ملک میں طاقتور ترین لوگوں کے ساتھ تعلقات تھے وہ اپنے حصص کی فروخت میں حائل انتظامی رکاوٹوں کو ختم نہیں کرسکا۔ یہ ایک ایسا سودا تھا جس کے پاکستان کے لیے کوئی مالی مضمرات نہیں تھے اور یہ سودا پاکستان کے لیے بہت زیادہ منافع بخش تھا۔ اس سارے معاملے میں جو کچھ نظر آرہا ہے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ یہ سب کیسے اور کیوں ہوا؟ کچھ لوگ قیاس آرائی کرتے ہیں کہ پاکستان میں بڑھتے ہوئے چینی اثر و نفوذ کے بارے میں امریکیوں میں ناراضی پائی جاتی ہے۔ یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں طاقتور لوگوں کے لیے سب کچھ ممکن ہے اگر وہ صحیح دروازوں پر دستک دیں، یہ سودا کیوں ناممکن بن گیا؟ کیا امریکیوں نے کراچی الیکٹرک کے سودے کو ناکام بنایا؟ اگر ایسا ہی ہوا تھا تو کیا یہ ابراج گروپ کو بچا سکتا تھا؟

میر لبون کی عدالت میں پیشی کے بعد جب عارف نقوی مایوسی کے تاثرات لیے کمرۂ عدالت سے باہر آئے تو صحافیوں کے ایک گروپ سے کہا کہ ”اس قدر اُداس اور بیزار نہ ہوں“۔ کیا وہ ماسک کے پیچھے چہرے پر مسکراہٹ لانا چاہ رہے تھے؟ یہ اندازہ لگانا خاصا مشکل تھا۔ بہر حال ان کی اس بات نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اسی حیرت میں ان سے پوچھا کہ ”وہ کیسا محسوس کررہے ہیں؟“ ان کا جواب تھا کہ ”بالکل ٹھیک“ مگر اُن کا یہ جواب مجھے قطعی قائل نہ کرسکا۔

"Footprints: Arif Naqvi — the man who flew too close to the sun". ("Dawn". Feb.1st, 2021)

بقیہ: مضبوط خاندان مضبوط معاشرہ

مضبوط خاندان میں ایجابی اپروچ ہوتی ہے!

منفی سوچ خاندان کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتی ہے۔ مثبت سوچ اور ایجابی اپروچ سے خاندان کی فضا خوش گوار اور اس کی دیواریں پائیدار رہتی ہیں۔ شوہر اور بیوی سے لے کر بڑے خاندان تک بے شمار مسائل ایجابی سوچ کے نتیجے میں یا تو پیدا ہی نہیں ہوتے ہیں یا شروع ہی میں ختم ہوجاتے ہیں۔ علیحدہ خاندان اور مشترک خاندان کی بحث ہو، پرانے رواجوں اور نئے فیشنوں کے بیچ ٹکراؤ ہو، کاموں کی تقسیم اور مراتب کے فرق کا مسئلہ ہو، مزاجوں اور طبیعتوں میں میل نہ ہو پانے کی دشواری ہو، غرض ایسی بہت سی الجھنیں مثبت سوچ اور ایجابی اپروچ کے ذریعے خوبی سے حل کی جاسکتی ہیں۔

خاندان کا سر رشتہ شوہر اور بیوی کا رشتہ

یوں تو خاندان بہت سے رشتوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے، لیکن خاندان کا مرکزی رشتہ شوہر اور بیوی کا رشتہ ہوتا ہے، اسی رشتے سے پھر باقی تمام رشتے وجود میں آتے ہیں۔ یہ رشتہ انسان خود قائم کرتا ہے اور اسے ختم کرنے کا اختیار بھی اسی کے پاس ہوتا ہے۔ یہ رشتہ قائم ہوتا ہے تو دو بڑے خاندانوں کے بیچ قربت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور جب یہ رشتہ ٹوٹتا ہے تو بہت سے رشتے موتی کے دانوں کی طرح دور دور بکھر جاتے ہیں۔ انسانی زندگی کا اور انسانی خاندانوں کا سفر اسی رشتے کی بدولت جاری و ساری ہے۔ اگر خاندان کے تمام لوگ اپنی توجہ اس رشتے کو محفوظ اور مضبوط بنانے پر مرکوز رکھیں تو پورے خاندان میں مضبوطی آتی ہے۔

دورِ جدید میں یوں تو پورے خاندان کا ادارہ شدید خطروں سے دوچار ہے، لیکن سب سے زیادہ خطرہ شوہر اور بیوی کے رشتے کو درپیش ہے۔ پہلے ساس اور بہو کے جھگڑے اور مشترکہ خاندان کے مسائل کا چرچا زیادہ ہوتا تھا، لیکن اب تو سب سے بڑا مسئلہ خود شوہر اور بیوی کے باہمی تعلقات کا بنا ہوا ہے۔ پہلے جہیز وغیرہ کی تباہ کاریاں زیادہ سننے کو ملتی تھیں مگر اب شوہر اور بیوی کے بیچ تناؤ خاندانوں کے لیے بہت بڑا چیلنج بنا ہوا ہے۔

بڑھو اسلام کی طرف!

دکھوں کے مارے انسان کو خاندان کے آغوش کی جتنی ضرورت پہلے تھی اس سے کہیں زیادہ آج ہے۔

خاندان میں در آئی خرابیوں کی اصلاح ہوتی رہے، چاہے وہ کتنی ہی پرانی ہوں۔ اس کے اندر سے ظلم اور گھٹن کے اسباب کو دور کیا جائے، چاہے ان اسباب کو کتنا ہی تقدس ملا ہوا ہو۔ خاندان کے اندر اعلیٰ قدروں کو فروغ دیا جائے۔ یہ سب کچھ کرنا ضروری ہے۔ تاہم کسی بھی حوالے سے خاندان سے بیزاری درست نہیں ہے۔ یہ جائے پناہ سے وہ راہ فرار ہے جس کے آگے کوئی جائے پناہ نہیں۔

آج انسانیت کو بہت بڑا خطرہ نئی نسل میں بڑھتی ہوئی خاندان سے بیگانگی اور شادی کے رشتے سے بیزاری سے درپیش ہے۔ اللہ کے بھیجے ہوئے دین اسلام کی تعلیمات اور اللہ کی دی ہوئی عقل کی تجلیات کو ساتھ لے کر انسانیت کو اس خطرے سے بچایا جاسکتا ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ ”زندگی نو“ نئی دہلی۔ فروری ۲۰۲۱ء)

جمہوریت کا عالمگیر عہدِ زوال؟

Frank Vogl

آج دنیا بھر میں جمہوریت کو خطرے میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آمریت کے ادوار آتے جاتے رہتے ہیں۔ آمریت اب شکل بدلنے لگی ہے۔ بعض جمہوری معاشروں میں ایک خاص طبقہ اتنا مضبوط ہو چکا ہے کہ تمام فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور اقتدار و اختیار کے تمام مآخذ پر اثر انداز ہو کر اپنے مفادات کو زیادہ سے زیادہ پروان چڑھاتا رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں معاملات مزید الجھتے ہیں اور عام آدمی کے لیے زندگی دشوار تر ہوتی جاتی ہے۔ جمہوری معاشروں میں حقیقی نمائندگی کا فقدان ہے۔ منتخب ایوانوں پر وہ لوگ متصرف ہیں جو عوام کے حقیقی نمائندے نہیں اور یوں اُن کے ہاتھوں میں تمام وسائل اُن کی مرضی کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ کوئی کتنی ہی کوشش کر دیکھے، معاملات درست ہونے کا نام نہیں لیتے۔ تمام ہی شعبوں پر ایک خاص طبقے کا واضح اثر و نفوذ دکھائی دیتا ہے۔

دی اکنامسٹ انٹیلی جنس یونٹ (ای آئی یو) نے حال ہی میں سالانہ ڈیموکریسی انڈیکس کے ذریعے بتایا ہے کہ امریکا میں جمہوریت انتہائی ناقص ہے اور اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلکہ مکمل جمہوریت اُس کے پڑوسی کینیڈا میں پائی جاتی ہے۔ ای آئی یو کی بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ ای آئی یو نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے وہ آج کی دردناک حقیقت ہے۔ آج دنیا بھر میں جمہوریت انتہائی مخدوش حالت میں ہے اور امریکا جیسے جمہوریت کے علم بردار ملک میں بھی جمہوری اقدار کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ حال ہی میں ختم ہونے والے ڈونلڈ ٹرمپ کے عہدِ صدارت کے ترکے کو ذہن نشین رکھ کر سوچا جائے تو مایوسی ہوتی ہے کہ امریکا جیسا جمہوریت کا علم بردار ملک ہی جمہوری اقدار کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ امریکی ایوانِ صدر میں ڈونلڈ ٹرمپ نے جو چار سالہ اسٹنٹ کیا اُس نے پوری دنیا میں جمہوریت کے حوالے سے شدید نوعیت کی قنوطیت کو بڑھا دیا ہے۔

جمہوریت کے نقطۂ نظر سے ۲۰۲۰ء خاصا مایوس کن سال تھا۔ دنیا بھر میں حکومتوں نے پارلیمان کے چیک اینڈ بیلنس کو محدود کیا، بہت سے ممالک میں انتخابات کو ملتوی یا منسوخ کر دیا گیا، عوام کے احتجاج کا دائرہ محدود کر دیا گیا، رائے کے اظہار کی آزادی پر بھی قدغن لگائی گئی اور تعلیم و صحتِ عامہ سمیت بہت سے معاملات میں شدید نوعیت کی بدعنوانی کو راہ ملی۔

تلخ حقیقت یہ ہے کہ آج دنیا بھر میں جمہوریت کو شدید ترین مشکلات کا سامنا ہے۔ ہانگ کانگ میں چین نے جمہوریت کی راہ روکی ہوئی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں بھی ایسی ہی صورتِ حال ہے۔ عرب دنیا میں اور بالخصوص خلیج فارس کے خطے میں معاملات بہت الجھے ہوئے ہیں۔ آمریت کو برقرار رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے۔ بادشاہتوں کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے پر اس قدر زور دیا جا رہا ہے کہ عوام میں غصہ اور مایوسی دونوں ہی کا گراف بلند ہو رہا ہے۔ جمہوریت کے لیے آواز اٹھانے والوں کے خلاف سخت گیر رویہ عام ہوتا جا رہا ہے۔ مصر میں عشروں کے بعد بحال ہونے والی جمہوریت کو محض ایک سال بھی برداشت نہیں کیا گیا اور فوج نے دوبارہ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ شمالی افریقا کے علاوہ لاطینی امریکا کی صورتِ حال بھی مایوس کن ہے۔ وسطِ ایشیا میں بھی جمہوریت کے پنپنے کے امکانات مخدوش ہیں۔ ای آئی یو نے جمہوریت کے حوالے سے جو عالمی تصویر پیش کی ہے وہ واقعی محض پریشان کن نہیں، مایوس کن بھی ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج دنیا بھر میں پارلیمانی جمہوریت کو نیچا دکھانے کی کوششیں زور پکڑ رہی ہیں؟ پارلیمنٹ کے ذریعے جوابدہی کی روایت کو کمزور کرنے کے لیے آمرانہ ذہنیت کے لوگ میدان میں آ گئے ہیں۔ ہر طرح کی بدعنوانی کو زیادہ سے زیادہ پروان چڑھانے کی سرتوڑ کوشش کی جا رہی ہے۔ جمہوریت کے لیے جدوجہد کرنے والوں کا ناطقہ بند کرنے کی طرف بھی بھرپور توجہ دی جا رہی ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ حقیقی نمائندگی کا علم بلند کرنے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو اور وہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جمہوریت کی خاطر میدان میں آنے سے گریز کریں۔

بدعنوانی کے لیے اچھا موقع

ای آئی یو نے کئی سال سے اپنے سروے اور رپورٹس میں بتایا ہے کہ دنیا بھر میں جمہوری اقدار اور جمہوریت پسندی کے کلچر کو زیادہ سے زیادہ کمزور کرنے اور نیچا دکھانے کی بھرپور کوششیں کی جا رہی ہیں۔ عوام کے ذہنوں میں میڈیا کے ذریعے یہ نکتہ ٹھونسا جا رہا ہے کہ جمہوریت کوئی ایسا عمل نہیں جس سے بہتر زندگی کی راہ نکلتی ہو۔ عوام کے منتخب نمائندوں میں بھی بدعنوانی تو پائی جاتی ہے مگر اس بدعنوانی کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ عام آدمی کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ عوام کی آرا سے منتخب ہونے والے تو ہوتے ہی بدعنوان ہیں اور یہ کہ اُن سے ملک و قوم کی بھلائی کی توقع رکھنا فضول ہے۔ رہی سہی کسر کورونا کی وبا نے پوری کر دی۔ دنیا بھر میں حکومتوں نے سخت گیر رویہ اپناتے ہوئے جمہوری اقدار کو مزید پامال کرنے پر توجہ دی ہے۔ عوام سے رائے طلب کیے بغیر اُن پر فیصلے تھوپے جا رہے ہیں۔

ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے کرپشن ٹرانسپیرنسی انڈیکس (سی ٹی آئی) کے ذریعے بتایا ہے کہ ۱۸۰ ممالک کا سروے کیا گیا اور معلوم یہ ہوا کہ ان میں سے دو تہائی میں بدعنوانی غیر معمولی حد تک پائی جاتی ہے۔

کورونا کی وبا کے دوران لاک ڈاؤن اور دیگر اقدامات کے باعث بڑے پیمانے پر مالیاتی دشواریاں پیدا ہوئیں۔ پس ماندہ ممالک کی حالت بہت بُری ہے۔ اچھی خبر یہ ہے کہ کورونا کی ویکسین آ چکی ہے اور مغرب کے ترقی یافتہ ممالک ویکسی نیشن کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ معیشتیں بحالی کی طرف گامزن ہیں۔ مغرب کے ترقی یافتہ اور بالخصوص صنعتی ممالک نے اپنی معیشت کو نئی زندگی دینے سے متعلق جو اقدامات کیے ہیں وہ پوری دنیا کے لیے اچھی خبر لائے ہیں۔ پس ماندہ ممالک کو بھی اب معیشتی بحالی کے حوالے سے کچھ نہ کچھ ملے گا۔ ترقی پذیر ممالک کی معیشتیں بھی بحالی کی طرف گامزن ہیں۔ معیشتوں کی بحالی کا عمل شروع ہونے سے معاملات بہت حد تک درستی کی طرف مائل ہوں گے۔

یہ سب تو ٹھیک ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ جہاں حکمرانی کا معیار ہی پست ہو وہاں کیا ہو سکے گا۔ دنیا بھر میں ایسی حکومتوں کی تعداد کم نہیں جو پست معیار کی حکمرانی کے ہاتھوں ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں ملک کا نظم و نسق ہے اُن میں مطلوب اہلیت ہے نہ کچھ کر دکھانے کا عزم۔ وہ چاہتے ہیں کہ معاملات ویسے ہی رہیں جیسے ہیں یعنی کوئی بڑی تبدیلی رونما نہ ہو۔ کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جب معاملات یہ ہوں تو کوئی بھی بڑی اور مجموعی طور پر مثبت تبدیلی کیونکر آ سکتی ہے۔ حکومتوں کی بدعنوانی پر نظر رکھنے والے ادارے بہت مایوس کن تصویر پیش کر رہے ہیں۔ بدعنوانی کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ ترقی پذیر اور پس ماندہ دنیا میں

بیشتر ممالک قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ معاملات کو درست کرنے کے بجائے قرضے لے کر کام چلایا جاتا رہا ہے۔ یہ کیفیت اب خطرناک شکل اختیار کرچکی ہے۔ لبنان اور جنوبی افریقا کی مثال بہت نمایاں ہے۔ ان دونوں ممالک کے اندرونی اور بیرونی قرضے تباہ کن سطح تک پہنچ چکے ہیں۔ جنوبی افریقا کی حکومت نے کورونا کی وبا کے دوران برملا کہا کہ وہ کسی بھی اعتبار سے اس پوزیشن میں نہیں کہ عوام کے لیے کچھ کر سکے اور اس کا سبب یہ ہے کہ خزانے میں کچھ ہے ہی نہیں۔

ترقی پذیر دنیا کا مالیاتی بحران بھی گہرا ہوتا جارہا ہے۔ حکومتیں قرضے لے لے کر کام چلاتی آئی ہیں۔ یہ سب کچھ مزید نہیں چل سکتا۔ اندرونی قرضوں کا حجم حکمرانوں کی راتوں کی نیندیں اڑانے کے لیے کافی ہے۔ سبھی پریشان ہیں کہ اس مصیبت سے چھٹکارا کیسے پائیں۔ نجی شعبے کی مدد سے کچھ کرنا بھی اب ممکن نہیں رہا کیونکہ وہ صورتِ حال کی نزاکت دیکھتے ہوئے غیر معمولی حد تک محتاط ہو چکا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں ایک عشرے قبل پرائیویٹ انویسٹمنٹ مینیجرز نے حکومتوں کو نجی شعبے سے قرضے لینے کا راستہ سجھایا تھا۔ اب یہ سب کچھ بھی ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

اس وقت درمیانی اور کم آمدنی والے ۱۲۰ سے زائد ممالک کے بیرونی قرضوں کا ۸۵ فیصد خالص غیر رعایتی نوعیت کا ہے، یعنی جو کچھ بھی واجب الادا ہے وہ ہر حال میں ادا کرنا ہی ہے۔ پنشن کا دباؤ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ عالمی بینک کے ماہرین معاشیات پیٹر نیگل اور ناؤتا کائنگا وارا نے ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ مزید ممالک کے دیوالیہ پن کی حد تک پہنچنے کے خدشات برقرار ہیں۔ ان دونوں ماہرین معاشیات نے پھر بھی کچھ محتاط رہتے ہوئے بات کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی پذیر اور پس ماندہ دنیا کے بیشتر ممالک دیوالیہ ہو ہی جائیں گے۔ لبنان، ارجنٹائن اور زیمبیا کی طرح اُنہیں معیشتی ڈھانچے کی تبدیلی کے عمل سے گزرنا پڑے گا۔ قرضوں کی بنیاد پر جینے والے ممالک کا یہی انجام ہوتا آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت قرضوں میں دبے ہوئے ممالک میں سے کم و بیش ۴۰ فیصد انتہائی نوعیت کے خطرے سے دوچار ہیں۔

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ نے بہت سے ممالک کو بیل آؤٹ پیکیج دے کر معیشت کی بحالی کی راہ پر گامزن ہونے میں مدد دی ہے۔ یہ سلسلہ رک گیا تھا۔ ڈونلڈ ٹرمپ کے عہدِ صدارت کا امریکا اس حوالے اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اب جی سیون ممالک نے قرضوں تلے خطرناک حد تک دبے ہوئے ممالک کو نئی زندگی دینے کے حوالے سے کچھ سوچا ہے تو امریکا نے بھی منصوبے کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔ صدر جوزف بائیڈن اس معاملے میں خاصی دلچسپی لیتے دکھائی دے رہے ہیں۔ آئی ایم ایف نے کئی ممالک کے لیے بیل آؤٹ پیکیج تیار کیے ہیں اور اندازہ لگایا جارہا ہے کہ اب کے موسمِ گرما کے دوران ہی متعدد ممالک کو بیل آؤٹ پیکیج دے دیا جائے گا۔ مالیاتی امور کے بہت سے ماہرین اس صورتِ حال کو بھی خطرناک قرار دے رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بیل آؤٹ پیکیجز سے بھی بعض ممالک مزید قرضوں تلے دب کر رہ جائیں گے۔

قرضوں تلے خطرناک حد تک دبے ہوئے ممالک کے عوام کو نئی اور بہتر زندگی کی نوید اُس وقت مل سکے گی جب اُن کے قرضے معاف کردیے جائیں۔ ایسا ہوگا تو جمہوریت بھی پروان چڑھ سکے گی۔ جب تک قرضوں کا بحران ختم نہیں ہوتا، عوام کی حقیقی حکمرانی کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر پسماندہ ممالک کے قرض خواہ تھوڑی بہت رعایت دیں یعنی ادائیگیاں کچھ مدت کے لیے موخر کردیں تو یہ بھی ایک بڑی خدمت ہوگی۔ اس سے بحران تو خیر ختم نہیں ہوگا تاہم قرضوں تلے دبے ہوئے ممالک کو سکون کا سانس لینے کا موقع ضرور مل جائے گا۔

ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ قرضوں تلے دبے ہوئے ممالک کی مدد کرنے کے نام پر کیے جانے والے اقدامات وہاں پھیلی ہوئی بدعنوانی پر قابو پانے کے حوالے سے کچھ بھی نہیں کرتے۔ جمہوری معاشروں میں پھیلی ہوئی بدعنوانی پر قابو پانے سے متعلق کچھ کرنا تو دور کی بات ہے، کچھ سوچا بھی نہیں جاتا۔ یہی سبب ہے کہ بیل آؤٹ پیکیج مل جانے پر بھی بہت سے پس ماندہ ممالک ڈھنگ سے جینے کے قابل نہیں ہو پاتے، بدعنوانی برقرار رہتی ہے اور جمہوریت کی کشتی گرداب ہی میں پھنسی رہتی ہے۔ بدعنوانی پر قابو پانے کے حوالے کچھ نہ کیے جانے ہی کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ آج دنیا بھر میں جمہوریت زوال پذیر ہے۔ منتخب نمائندوں کی بدعنوانی پر چیک اینڈ بیلنس کا نظام لایا ہی نہیں جارہا۔ یہ سب کچھ جب حد سے بڑھتا ہے تب آمریت کو راہ ملتی ہے۔ لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ ایسی جمہوریت سے تو آمریت ہی بھلی۔ کم از کم یہ دکھ تو نہ ہوگا کہ ہمیں ہمارے اپنے منتخب نمائندے لوٹ رہے ہیں۔

چند ایک ممالک نے اپنے طور پر کچھ کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں جمہوریت کا گراف بلند کرنے میں مدد ملی ہے۔ البانیا بھی ایک ایسا ہی ملک ہے جس نے آمریت کو پیچھے دھکیل کر جمہوریت کو خاصے منظّم انداز سے پروان چڑھایا ہے اور یوں وہ جمہوری کلچر کے اعتبار سے کی جانے والی درجہ بندی میں اب امریکا کے ساتھ کھڑا ہے۔

"Is democracy in decline globally?"
("theglobalist.com". February 21, 2021)

بقیہ: لیبیا میں سیاسی استحکام کی ضرورت

یہ سب سیاسی اسلام پسندوں اور امن پسند سیکولر انقلابیوں کے اس تصور کے خلاف ہے کہ طاقت کو طاقت سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ کہ آمروں کا سامنا کرنے کے لیے طاقت کے استعمال کی صورت میں ہم دراصل ان کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہوتے ہیں۔ اخلاقی سطح پر ان کی بات درست ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف پند و نصائح سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہوتی تو طرابلس کو خلیفہ ہفتار کے جنگجوؤں کے پنجوں سے بچانے میں کامیاب نہیں ہوا جاسکتا تھا۔

لیبیا کے بہت سے علاقوں میں خلیفہ ہفتار کے جنگجوؤں نے انسانیت سوز مظالم ڈھائے اور بنیادی حقوق پامال کیے۔ اگر طرابلس بھی ان کے کنٹرول میں آگیا ہوتا تو یہاں بھی انسانیت سوز مظالم ہی ڈھائے جاتے۔

امریکی انقلاب میں فرانس کی طاقت کے ذریعے ہی انقلابیوں نے برطانوی سامراجیوں کو نکال باہر کیا تھا۔ لیبیا کے معاملے میں بھی طاقت کا استعمال ہی آمروں کو پیچھے ہٹانے اور ان کے نوآبادیاتی دوستوں کو کمزور کرنے میں کلیدی کردار کا حامل رہا ہے۔

اگر لیبیا میں سیاسی تبدیلیاں کامیاب رہیں تو مصر اور تیونس پر بھی اچھے اثرات مرتب ہوں گے کیونکہ ان دونوں پڑوسیوں کی معیشت کا مدار بہت حد تک لیبیا کے استحکام پر ہے۔ لیبیا میں لڑائی ختم ہوا س میں لیبیا کے علاوہ مصر اور تیونس کا بھی فائدہ ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ اب معاملات حقیقی امن اور استحکام کی طرف جائیں گے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Libya's surprise election is bad news for meddling powers".
("middleeasteye.net". February 8, 2021)

بقیہ: امریکا کے لیے ایشیا میں چیلنج

موجودہ اقتصادی صورتحال میں پرانے ایشیا کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن امریکا اپنی منفرد صلاحیت کا استعمال کرتے ہوئے چین سے مقابلہ کرسکتا ہے اور ایک قابلِ تقلید ملک کے طور پر اپنا کردار دوبارہ حاصل کرسکتا ہے۔ ٹرمپ کے برعکس بائیڈن کے لیے سب سے پہلے امریکا کے پیغام پر عمل کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ (ترجمہ: سید طالوت اختر)

"Meeting the challenge in Asia".
("nationalinterest.org". December 22, 2020)

مضبوط خاندان مضبوط معاشرہ

محی الدین غازی

انسانی سماج کے سب سے زیادہ حسین اور دل کش نظارے خاندان کے دائرے میں نظر آتے ہیں۔ شوہر اور بیوی کی محبت، ماں باپ کی شفقت، چھوٹوں سے پیار، بڑوں کا احترام، بیماروں کی تیمار داری، معذوروں کی مدد، بوڑھوں کو سہارا، ایک دوسرے کے کام آنا، سب کو اپنا سمجھنا، خوشی اور غم کے مواقع پر جمع ہوجانا۔ غرض خاندان ایک چھوٹا سماج ہوتا ہے، اور یہ چھوٹا سماج جتنا زیادہ مضبوط اور خوب صورت ہوتا ہے، بڑے سماج کے لیے اتنا ہی زیادہ مفید اور مددگار ہوتا ہے۔

اللہ کے دین کی برکتوں کا سب سے کم محنت سے سب زیادہ ظہور خاندان کے دائرے میں ہوتا ہے۔ اس دائرے میں رہتے ہوئے اقامت دین کی راہ کے بہت سے تجربات اور مشاہدات ممکن ہوجاتے ہیں۔ گھر بھی ایک درجے کی ریاست ہوتی ہے اور اسے مثالی اسلامی ریاست بنانا اقامت دین کے سفر کی ایک اہم منزل ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے جہاں ریاست کے امام کو اس کی ذمہ داری یاد دلائی وہیں گھر کے افراد کو بھی ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔ آپ نے فرمایا:

”تم سب ذمہ دار ہو اور تم سب اپنی رعایا کے سلسلے میں جوابدہ ہو۔ امام ذمہ دار ہے اور اپنی رعایا کے سلسلے میں جوابدہ ہے۔ اور مرد اپنے اہل خانہ میں ذمہ دار ہے اور وہ اپنی رعایا کے سلسلے میں جوابدہ ہے۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر میں ذمہ دار ہے اور وہ اپنی رعایا کے سلسلے میں جوابدہ ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان میں مرد کی حیثیت بھی ذمہ دار کی ہے اور عورت کی حیثیت بھی ذمہ دار کی ہے، اور ان کا گھر ان کے لیے رعایا کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہتر خاندان کی تشکیل کی ذمہ داری اور جوابدہی دونوں پر عائد ہوتی ہے۔

مضبوط خاندان کی ٹھوس بنیادیں

دور جدید میں جب کہ ہر چیز کی مادی توجیہ کی جاتی ہے، یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ خاندان محض ایک سماجی رواج ہے جو وقتی ضرورتوں کے تحت وجود میں آیا اور جب وہ ضرورت باقی نہیں رہے تو اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی انسان کے ارتقا کا تقاضا ہے۔ اسلام اس تصور کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا ہے۔ وہ خاندان کو نوع انسانی کا ایک ناگزیر عنصر مانتا ہے، جس سے علیحدگی اور دوری نوع انسانی کے لیے خطرناک حد تک نقصان دہ ہے۔

اسلام میں خاندان کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور اس کی مضبوطی کے لیے ٹھوس اور گہری بنیادیں فراہم کی گئی ہیں۔

رشتے ناطے امتحان ہیں

اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان کی زندگی ایک امتحان ہے اور رشتے اس امتحان کا ایک اہم حصہ ہیں۔ امتحان کی نفسیاتی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں آسان سوالوں کو انسان خوش دلی سے حل کرتا ہے اور مشکل سوالوں کو درست طریقے سے حل کرنے کے لیے اپنی ساری توانائی صرف کردیتا ہے۔ رشتوں کو امتحان مان لینے کا نفسیاتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ہر رشتے کو خوبی کے ساتھ نباہ لینے کی کوشش کرتا ہے خواہ اس کے لیے اسے کتنی ہی مشقت اٹھانی پڑے۔ دشوار صفت رشتے نباہ لینے میں اسے کامیابی ملتی ہے تو وہ اسی طرح خوش ہوتا ہے جس طرح ایک مشکل سوال حل کرلینے پر خوشی حاصل ہوتی ہے۔

امتحان کا تصور رشتوں کے ساتھ تعامل کی کیفیت کو بالکل بدل دیتا ہے۔ پھر انسان مسائل سامنے آنے پر رشتوں سے فرار نہیں اختیار کرتا ہے بلکہ رشتوں کو نباہنے کی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے۔

رشتے انسان کا امتیاز ہیں!

خاندان اور رشتوں کا جو نظام انسان کو حاصل ہے وہ صرف انسانوں کا امتیاز ہے، اور انسانی شرف کی ایک علامت ہے۔ رشتوں کا یہ نظام حالات وضروریات کے تحت انسانوں کی اپنی اختراع نہیں ہے، بلکہ زندگی کے دیگر امتیازی انتظامات کی طرح یہ خاص انسانی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا امتیازی انتظام ہے جو انسانوں کو خصوصی طور پر عطا کیا گیا ہے۔ انسانی ضرورتوں کی تکمیل غول اور جھنڈ سے پوری نہیں ہوسکتی ہے، اسے قدم قدم پر رشتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

تمام رشتے اللہ نے بنائے ہیں!

رشتے اللہ نے بنائے ہیں، اس لیے انھیں خاص تقدس اور احترام حاصل ہے۔ ان کو توڑنا یا ان کی بے حرمتی کرنا اللہ کے حدود سے تجاوز کرنا اور اللہ کی نافرمانی کرنا ہے۔ اسی لیے اللہ کی ناراضی کا خوف رشتوں کا سب سے بڑا محافظ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں خلافت کا جو بڑا مقام عطا کیا ہے، اس کے لیے خاندان اور رشتوں کے اس نظام کا ہونا لازمی تھا۔ ان رشتوں کے ساتھ صحیح تعامل کرتے ہوئے انسان خلافت کی ذمہ داری کو بہتر طریقے سے انجام دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشتوں کو نباہنے کا فطری جذبہ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کی بار بار تاکید بھی کرتا ہے۔

تمام رشتے محبت واحترام کے رشتے ہیں!

جب تمام رشتوں کا ایک سرا اللہ سے ملتا ہے، اس معنی میں کہ اللہ رشتوں کا خالق ہے، اور اس نے رشتوں کی پاسداری کا حکم دیا ہے، تو پھر بلا تفریق تمام رشتوں کی پاسداری ضروری قرار پاتی ہے۔ رشتوں میں مراتب کا فرق تو ہوسکتا ہے، لیکن رشتوں میں ایسی تفریق جائز نہیں ہے کہ کچھ رشتوں کو باقی رکھا جائے اور کچھ کو ختم کردیا جائے۔ غرض خرابی انسانوں کے اندر تو ہوسکتی ہے، لیکن خود رشتوں میں کوئی ایسی خرابی نہیں پائی جاتی کہ کسی رشتے کو نفرت کا رشتہ قرار دیا جائے۔

رشتے انسان کا پیدائشی اور بنیادی حق ہیں!

یہ اللہ کی حکمتِ تخلیق ہے، اور انسان پر اس کا بہت بڑا کرم ہے کہ جب وہ پیدا ہوتا ہے تو دو بڑے خاندانوں کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی اسے دو بڑے خاندانوں سے تعلق عطا ہوجاتا ہے۔ یہ پیدا ہونے والے انسان پر اللہ کی خصوصی عنایت ہوتی ہے۔ جو لوگ خاندان کے ادارے سے باہر، شادی کے بغیر، ناجائز طریقے سے بچے کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں وہ اس پیدا ہونے والے بچے پر اس پہلو سے بھی ظلم کرتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ اپنے خاندان سے کٹے رہتے ہیں اور پیدا ہونے والے بچوں کو دو خاندانوں کی خوش گوار فضا نہیں مہیا کرتے ہیں وہ بھی اپنے بچوں کو ان کے پیدائشی اور بنیادی حق سے محروم کردیتے ہیں۔ ہر بچے کا حق ہے کہ اسے ننھیال اور ددھیال دونوں حاصل ہوں، اور والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچے کو اس حق سے محروم نہ ہونے دیں۔

رشتے انسان کی بھلائی کے جذبے کو تکمیل کے مواقع فراہم کرتے ہیں!

انسان کے اندرون کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ بیرونی دنیا سے جڑے ہوئے اپنے اندر موجود متنوع جذبوں کی تکمیل کرتا ہے۔ خاندان کی دنیا میں ایک انسان کو اپنے بہت سے جذبوں کی تکمیل کا موقع حاصل ہوتا ہے، اور یہ تمام مواقع اس کے اردگرد بہت قریب ہوتے ہیں۔ بڑے بوڑھوں کے ساتھ تعلق، چھوٹے بچوں کے ساتھ تعلق، ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ تعلق، شفقت کا جذبہ، خدمت کا جذبہ، محبت کا جذبہ، غم

بانٹنے اور خوشی میں شریک کرنے کا جذبہ، دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہونے کا خوب صورت احساس، دوسروں کے دکھ کو دور کرنے کا ناقابل بیان لطف۔ غرض نیکی اور بھلائی کے بہت سے جذبے جو انسانوں کی خصوصیت ہیں اپنی تکمیل کا سامان خاندان کی دنیا میں آسانی سے پا لیتے ہیں۔

رشتے تکافل وتعاون کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں!

تکافل انسان کی بہت بڑی ضرورت ہے، تکافل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کا ایک گروہ آپس میں معاہدہ کرلے کہ اس گروہ میں کسی کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو سب مل کر اس کے نقصان کی تلافی کر دیں گے۔ جتنے لوگ کسی ایک تکافل کے معاہدے میں شریک ہوتے ہیں وہ سب ایک دوسرے کی حسب معاہدہ کفالت کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ اس نظام کی افادیت سے انکار نہیں ہے، تاہم مادہ پرست دنیا میں تکافل کا یہ نظام تجارت کاری کے تحت آجاتا ہے، اور عام طور سے استحصال کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خاندان کی صورت میں تکافل کا فطری اور جذبات سے بھرپور نظام عطا کیا ہے۔ مضبوط خاندان میں حادثات اور حالات کا شکار ہونے والا ہر فرد اپنی طرف بہت سے ہاتھوں کو بڑھتا ہوا پاتا ہے۔ مضبوط خاندان میں رہنے والا فرد سکون اور اطمینان کی زندگی گزارتا ہے، اور اس کے دل کو بے شمار اندیشے خوف زدہ اور پریشان نہیں رکھتے ہیں۔

رشتے سماج میں انسان کی حصے داری کو یقینی بناتے ہیں۔ خاندان کے افراد کی طرف کفالت کا ہاتھ بڑھانے والے ایک طرح سے سماجی کفالت میں حصہ لیتے ہیں۔ اسے اس طرح سمجھا جائے کہ اگر کسی خاندان میں ایک یتیم کی کفالت کا انتظام نہیں ہو پاتا ہے تو وہ یتیم پورے معاشرے پر بوجھ ہوتا ہے۔ جب کہ اگر یتیم کی کفالت کا خاندان کے اندر ہی انتظام ہوجائے تو معاشرے پر یہ بوجھ نہیں پڑتا ہے۔ غرض یہ کہ اگر ہر خاندان کے افراد مل جل کر اپنے مسائل کو خود حل کرنے لگیں تو سماج میں مسائل کی شرح بہت کم رہ جائے گی۔ اسی طرح اگر اعلی اقدار کی تخم ریزی اور ان کے پودوں کی سیرابی خاندان کے اندر ہی ہوتی رہے تو ہر خاندان معاشرے کے لیے باعث خیر ورحمت بن جائے۔

رشتے انسان کو خوشی اور غم بانٹنے کا پلیٹ فارم دیتے ہیں!

انسان تنہا خوشی نہیں منا سکتا ہے، اسے خوشی منانے کے لیے انسانوں کا ساتھ چاہیے ہوتا ہے۔ انسان تنہا غم بھی نہیں سہار سکتا ہے، غم سہارنے کے لیے غم کو بانٹنے والے درکار ہوتے ہیں۔ خاندان مل جل کر خوشی منانے اور مل جل کر غم بانٹنے کے لیے ایک فطری پلیٹ فارم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی کی صورت گری ایسی کی ہے کہ اس میں بوجھ بھی بہت ہیں اور خوشیاں بھی بہت ہیں۔ زندگی کا بوجھ تنہا اٹھانا ممکن نہیں ہوتا ہے، زندگی کا سکھ بھی تنہا حاصل کر لینا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ مضبوط خاندان اسے یقینی بناتا ہے کہ انسان زندگی کا بوجھ بھی آسانی سے اٹھالے اور زندگی کے سکھ بھی حاصل کر سکے۔

مضبوط خاندان کے خدوخال

خاندان کو مضبوط بنانے کے لیے عقلی تقاضے بھی بھرپور رہنمائی کرتے ہیں، تاہم دینی رہنمائی ان تقاضوں کی تکمیل کے لیے طاقتور محرک ہوتی ہے۔ یہ دینی محرک انسان کو مشکل سے مشکل حالات میں مضبوط موقف اختیار کرنے پر آمادہ رکھتا ہے۔ عقل کے سامنے دنیا کی سعادت ہوتی ہے، جبکہ دین دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کا راستہ دکھاتا ہے۔ صرف عقل کی بنیاد پر تعمیر ہونے والی عمارت خواہشات اور حادثات کا صدمہ برداشت نہیں کرپاتی ہے۔ دین کی بنیاد پر تعمیر ہونے والی عمارت بہت ٹھوس اور مستحکم ہوتی ہے، ہر جھٹکے کو برداشت کرلیتی ہے۔ غرض مضبوط خاندان کی تشکیل عقل کا تقاضا بھی ہے اور دین کا تقاضا بھی ہے۔ عقل بھی رہنمائی کرتی ہے اور دین بھی رہنمائی کرتا ہے۔ مومن کی خوش نصیبی یہ ہے کہ وہ دونوں سے فیض اٹھاتا ہے۔

مضبوط خاندان میں اعلیٰ اصولوں کی پاسداری ہوتی ہے

اجتماعی معاملات میں عدل اسلام کا سب سے اہم اصول ہے، اس اصول کو برتنے میں سب لوگ شامل ہوجائیں تو خاندان مضبوط ہوجاتا ہے۔ خاندان کے تمام افراد کے درمیان عدل کیا جائے، مردوں اور عورتوں میں یا بیٹیوں اور بہوؤں یا دیگر افراد کے درمیان ایسا فرق جو ظلم کی حد تک پہنچ جائے اللہ کی ناراضی کا سبب بنتا ہے اور خاندان کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ عدل ہی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ خاندان کے مشترک فیصلے مشاورت اور باہمی رضامندی سے ہوں۔ اجتماعی زندگی میں من مانی کرنے کا رویہ ایک طرح کا ظلم ہوتا ہے اور بہت دنوں تک رشتوں کو برقرار نہیں رہنے دیتا ہے۔ غرض خاندان کا اعلی اقدار اور اصولوں سے رشتہ جتنا مضبوط رہے گا خاندان کی کڑیاں اسی قدر مستحکم رہیں گی۔

مضبوط خاندان میں لطیف جذبات کی رعایت کی جاتی ہے!

جذبات کو نازیبا الفاظ بھی ٹھیس پہنچاتے ہیں اور ناروا خاموشی بھی۔ بڑی باتوں کا جتنا اثر جذبات پر پڑتا ہے کچھ اتنا ہی اثر چھوٹی باتوں کا بھی پڑتا ہے۔

جذبات ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں اور انسان کی کمزوری یہ ہے کہ اسے صرف اپنے جذبات عزیز ہوتے ہیں۔ رشتوں کی کمزوری کا بڑا سبب جذبات کی یہ انانیت ہے۔ جب لوگ اپنے جذبات کے ساتھ دوسروں کے جذبات کا بھی خیال رکھتے ہیں تو رشتے بے انتہا مضبوط ہوجاتے ہیں۔

مضبوط خاندان میں سب کی کوشش رشتوں کو بچانے کی ہوتی ہے!

دو افراد میں تلخی ہوجائے اور باقی لوگ اس تلخی کو ختم کرنے کی کوشش کریں تو تلخیوں کو پنپنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ رشتوں میں خرابی اس وقت بڑھتی ہے جب دوسرے لوگ اسے بڑھانے میں حصہ لیتے ہیں۔

تلخیوں کو بڑھانے اور رشتوں کے خرمن میں چنگاریوں سے شعلے بھڑکانے کا شوق بہت خراب ہوتا ہے۔

مضبوط خاندان میں حسنِ اخلاق اور سمجھ داری کی حکومت ہوتی ہے!

خاندان ایک ایسی اجتماعیت ہے جس میں ایک دوسرے کے ساتھ بہت زیادہ تعلق وتعامل اور دوسرے کے رویے پر بہت زیادہ انحصار ہوتا ہے۔ حسن اخلاق اور سمجھ داری ہر اجتماعیت کے لیے ضروری ہوتی ہے، لیکن خاندان کی اجتماعیت تو ان دونوں کے بغیر چل ہی نہیں سکتی ہے۔

خاندان کے تقریبا تمام ہی مسائل کی پشت پر یا تو کسی کی ناسمجھی کارفرما ہوتی ہے یا کسی کی اخلاقی پستی ہوتی ہے۔ ناسمجھی کا علاج سمجھداری سے ہوتا ہے اور اخلاقی پستی کا مداوا اخلاقی بلندی سے ہوتا ہے۔ خاندان کو مضبوط بنانے کے لیے سمجھداری اور اخلاق کی عام سطح کو بلند کرنے کی کوششیں کرتے رہنا چاہیے۔

مضبوط خاندان میں رخنوں کو بھرنے کا انتظام ہوتا ہے!

رخنے تو ہر خاندان میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن مضبوط خاندان میں انھیں بڑھنے نہیں دیا جاتا ہے بلکہ انھیں بھرنے کے لیے بھی لوگ آمادہ وتیار رہتے ہیں۔ کوئی فرد بیماری کی وجہ سے اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرپاتا تو صحت مند لوگ اس کی اس کمی کو پورا کر دیتے ہیں، نادار کی طرف سے ہونے والی کوتاہی کی تلافی مال دار کر دیتے ہیں، ناسمجھ کی طرف سے ہونے والی غلطیوں کا مداوا سمجھ دار کر دیتے ہیں۔ بد اخلاق کی طرف سے ہونے والی بدتمیزی کو اعلی اخلاق والے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اس کے لیے احسان کی صفت مطلوب ہوتی ہے۔ اسلام اس صفت کی بہت زیادہ ہمت افزائی کرتا ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۸

معرکۂ محبت اور سرفروشی کی تمنا

اروندھتی رائے

۳۰ جنوری ۲۰۲۱ء کو معروف ناول نگار اور دانشور اروندھتی رائے نے ایلگر پریشاد کے اسٹیج پر ایک تقریر کی۔ انگریزی میں لکھی گئی اس تقریر کا متن انھوں نے شائع کروا دیا البتہ اسٹیج پر سامعین کی سہولت کے لیے اس کا ہندی ترجمہ کروا کر پڑھا جو بہت کچھ ٹوٹا پھوٹا تھا۔ بھارت میں جاری کسان احتجاج کو ایک وسیع تر منظرنامے میں سمجھنے کے لیے یہ گفتگو نہایت سودمند ہو سکتی ہے۔ (مترجم)

میں ایلگر پریشاد ۲۰۲۱ء کے منتظمین کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے مجھے اس فورم پہ گفتگو کے لیے مدعو کیا کہ جس روز روہت ویمولا کی بتیسویں سالگرہ ہوتا تھی اور فتح معرکۂ بھیما کوریگاؤں ۱۸۱۸ء کا دن بھی۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں جہاں برطانوی فوج کے تحت لڑنے والے مہار دستوں نے پیشوا سلطان باجی راؤ دوم کو شکست دی تھی جس کی رعیت میں مہار اور دلت ذاتیں بے رحمانہ ظلم کا شکار تھیں اور ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر نا قابلِ بیان طریقوں سے ان کی تحقیر کی جاتی تھی۔

مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس مقام سے دیگر مقررین کے شانہ بشانہ کھڑی ہوکر کسان احتجاج کی حمایت کرسکوں جو ان تین کسان قوانین کی فوری تنسیخ کا مطالبہ کر رہا ہے، جو کروڑوں کسانوں اور زراعت سے منسلک مزدوروں کے گلے میں گھسیڑے گئے ہیں اور انھیں سڑکوں پر لے آئے ہیں۔ آج ہم دورانِ احتجاج ہونے والی اموات پر اپنے غم و غصے کا اظہار کرنے کو جمع ہوئے ہیں۔ دہلی کی سرحدوں پر صورتحال، جہاں دو ماہ سے کسان پرامن دھرنا دیے ہوئے ہیں، تناؤ اور خطرے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ تحریک میں پھوٹ ڈالنے اور اس کی ساکھ خراب کرنے کے لیے ہر ممکن چال اور اشتعال انگیزی استعمال کی جا رہی ہے۔ اب ہمیں، پہلے سے بھی زیادہ، کسانوں کے ساتھ کھڑے ہونا ہوگا۔ ہم یہاں ان درجنوں سیاسی قیدیوں (بشمول ان کے جنھیں بھیما کوریگاؤں ۱۶ کہہ کر پکارا جا رہا ہے) کی رہائی کے مطالبے کے لیے بھی جمع ہوئے ہیں جنھیں مضحکہ خیز الزامات لگا کر سفاک انسدادِ دہشت گردی قوانین کے تحت گرفتار کیا گیا ہے۔ ان میں سے بہت سے محض کامریڈ نہیں ہیں بلکہ میرے ذاتی دوست بھی ہیں جن کے ساتھ میں نے قہقہے لگائے ہیں، چہل قدمی کی ہے اور اکٹھے کھانے کھائے ہیں۔ کوئی آدمی، حتیٰ کہ شاید خود گرفتار کرنے والے بھی، یہ یقین نہیں رکھتا کہ یہ لوگ ان فرسودہ جرائم میں ملوث ہیں جن کا ان پر الزام ہے یعنی وزیراعظم کے قتل کی منصوبہ سازی۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ لوگ اپنی دانشورانہ صراحت اور اخلاقی جرأت کی وجہ سے جیل میں ہیں اور ان دونوں خواص کو یہ حکومت ایک نمایاں خطرہ تصور کرتی ہے۔ ناموجود ثبوتوں کی خانہ پُری کے لیے بعض ملزموں کے خلاف فردِ جرم کئی ہزار صفحات پہ پھیلائی گئی ہے۔ کسی بھی منصف کے لیے انھیں پڑھنے کے لیے ہی کئی سال کا وقت درکار ہوگا، ان پر کوئی فیصلہ سنانا تو بعد کی بات ہے۔

ایک خطروں بھری تجویز

ان تھوپے گئے الزامات کے خلاف اپنا دفاع اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ ایک ایسے شخص کو جگانا جو سونے کا ناٹک کر رہا ہو۔ ہم سیکھ گئے ہیں کہ ہندوستان میں عدالتی ازالہ جوئی پر تکیہ کرنا ایک خطرناک تجویز ہے۔ خیر یہ کب اور کہاں ہوا ہے کہ عدالتوں نے ایک بار بھی فسطائیت کی لہر کو پلٹایا ہو؟ ہمارے ملک میں قوانین کا نفاذ من بھاتا ہوتا ہے اور جس کا انحصار آپ کی کلاس، ذات، لسانی شناخت، مذہب، جنس اور سیاسی نظریات پر ہوتا ہے۔ لہٰذا جب ایک طرف شعرا، پادری، طلبہ، سماجی کارکن، اساتذہ اور وکلا جیل میں ہیں تو دوسری طرف ہزاروں لوگوں کے قاتل، عادی ہتیارے، دن دھاڑے ہجوم گردی کرنے والے غنڈے، بدنام جج، زہریلے ٹی وی میزبان نہایت معقول معاوضہ پاتے ہیں اور اونچے مناصب کی آرزو رکھ سکتے ہیں، حتیٰ کہ سب سے اونچے منصب کی بھی! (اشارہ وزارتِ عظمٰی کی طرف ہے۔ مترجم)

کوئی اوسط ذہن کا آدمی بھی اس پیٹرن کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا جو دلال اشتعالیوں نے ۲۰۱۸ء کی بھیما کوریگاؤں ریلی اور ۲۰۲۰ء کے شہریت (مخالف) ترمیمی قانون اور اب کسانوں کے احتجاج کی ساکھ خراب کرنے اور اسے سبوتاژ کرنے کے لیے مستقل استعمال کیا۔ انھیں حاصل تحفظ چیخ چیخ کر یہ بتا رہا ہے کہ موجودہ دورِ حکومت میں یہ کس حمایت کے مزے لوٹتے ہیں۔ میں آپ کو دکھاؤں گی کہ کس طرح یہ پیٹرن عشروں تک دہرائے جانے کے نتیجے میں یہ لوگ طاقت میں آئے ہیں۔ اب جبکہ صوبائی انتخابات سر پر ہیں، ہم خوف سے منتظر ہیں کہ مغربی بنگال کے لوگوں کے مقدر میں کیا لکھا ہے۔ پچھلے دو برسوں میں کارپوریٹ میڈیا کی جانب سے ایلگر پریشاد کو بہ طور ایونٹ اور بہ طور ادارہ بے پناہ بدنامی اور شیطان سازی کا سامنا ہے۔ ایلگر پریشاد: بہت سے عام لوگوں کے ذہن میں ان دو لفظوں کو سن کر مشکوک انقلابیوں۔ دہشت گردوں، جہادیوں، شہری نکسل باڑیوں، دلت سیاہ چیتوں کی تصویر ابھرتی ہے، جو بھارت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس بد القابی، خطرے، خوف اور پریشانی کے ماحول میں اس نشست کا محض انعقاد ہی بہت حوصلے اور جرأت کا کام ہے جسے سلام پیش کیا جانا چاہیے۔ یہاں تقریب میں موجود ہم تمام لوگوں پر لازم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم بے باکی سے بات کریں۔

قریباً تین ہفتے قبل ۶ جنوری کو ہم نے دیکھا کہ ایک بڑا ہجوم کنفیڈریٹ جھنڈے، ہتھیار، سُولیاں، صلیبیں اٹھائے اور اونی کپڑے و شاخدار سینگ پہنے امریکی دارالحکومت پر پل پڑا، میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ، ''دھت تیرے کی، ہمارے ملک میں تو ہم پہلے ہی اس ہجوم کے بھائی بندوں کی رعایا ہیں جنھیں نے ہمارا کیپیٹول ہل ہتھیا لیا ہے۔ وہ جیت گئے ہیں''۔ وہ ہمارے اداروں پہ چڑھ دوڑے ہیں۔ ہمارے حکمران روز ہمارے سامنے نئے نئے اونی لباس اور شاخدار سینگ پہنے ظاہر ہوتے ہیں۔ ہمارا پسندیدہ امرت گائے کا پیشاب ہے۔ وہ ہمارے ملک کے تمام جمہوری اداروں کو کامیابی سے تباہ کرتے جا رہے ہیں۔ امریکا تو شاید کنارے سے پلٹ کر ایک سامراجی 'معمولہ' نما قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لیکن یہاں بھارت میں ہم صدیوں پرانے ماضی میں دھکیلے جا رہے ہیں جس سے چھٹکارے کے لیے ہم نے اتنی جدوجہد کی تھی۔

یہ ہم نہیں ہیں، یہاں ایلگر پریشاد میں اکٹھے ہونے والے متشدد یا انتہاپسند نہیں ہیں۔ یہ ہم نہیں ہیں، جو غیر قانونی اور غیر آئینی طریقے سے عمل کر رہے ہیں۔ یہ ہم نہیں ہیں جنھوں نے ان قتلِ عام سے صرفِ نظر کیا یا کھلم کھلا حمایت کی، جن میں ہزاروں مسلمان مارے گئے۔ یہ ہم نہیں ہیں جو چپ چاپ تماشا دیکھتے رہے جبکہ شہر کی گلیوں میں دلتوں کو کھلے عام مارا جا رہا تھا۔ یہ ہم نہیں ہیں جو لوگوں کو ایک دوسرے کے

خلاف بھڑکا رہے ہیں اور نفرت و تقسیم کے ذریعے حکومت کر رہے ہیں۔ یہ کام وہ لوگ کر رہے ہیں جنھیں ہم نے اپنی حکومت کے طور پہ منتخب کیا ہے اور ان کی پروپیگنڈہ مشین کر رہی ہے جو خود کو میڈیا کہتی ہے۔

بھیما کوریگاؤں کے معرکے کو دو سو سال ہو گئے۔ انگریز چلے گئے، مگر استعمار کی ایک شکل جو ان سے صدیوں پرانی ہے ابھی تک باقی ہے۔ پیشوا چلے گئے مگر پیشوائی - براہمنیت - نہیں گئی۔ براہمنیت، یہاں کے سامعین کو تو وضاحت کی ضرورت نہیں لیکن دوسرے ناواقف لوگوں کو بتاتی چلوں کہ براہمنیت وہ اصطلاح ہے جسے ذات - مخالف تحریک جاتی - ویوستا (ذات پات کا نظام) کے لیے تاریخی طور پہ استعمال کرتی آئی ہے۔ اس سے مراد صرف براہمن نہیں ہوتے۔ براہمنیت گویا ایک مرمت کدے میں رہی ہے، اور ایک جدید جمہوری نما لفظیات کا جامہ پہنے برآمد ہوئی ہے اور ذات پات کے نئے تنظیمی مینویل اور پروگرام (نیا نہیں، بلکہ مرمت شدہ) لائی ہے جس نے ان دلت - بہوجن لوگوں کی سرکردگی میں چلنے والی سیاسی جماعتوں کے لیے وجودی چنوتی پیدا کر دی ہے جو کبھی کچھ امید کا باعث ہوا کرتی تھیں۔

اور اس وقت، اکیسویں صدی کی براہمنیت کے لیے منتخب واہن (گاڑی) شدید دائیں بازو کی براہمن کنٹرولڈ راشٹریہ سیوک سنگھ ہے، جس نے ایک صدی کی انتھک محنت کے بعد اپنے معروف ترین رکن نریندر مودی کی صورت میں دہلی میں حکومت سنبھالی ہے۔

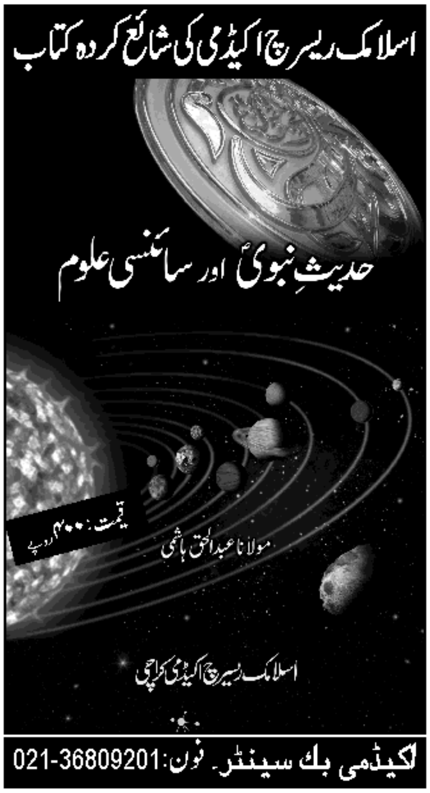
اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب
حدیثِ نبویؐ اور سائنسی علوم
قیمت: ۴۰۰ روپے
مولانا عبدالحق ہاشمی
اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی
اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36809201

کارپوریٹ طبقہ

بہت سے لوگ، جن میں خود کارل مارکس بھی شامل تھا، یہ یقین رکھتے تھے کہ جدید سرمایہ داری ہندوستان میں ذات پات کے نظام کو ختم یا کم از کم کمزور کر دے گی۔ کیا اس نے کیا؟ دنیا بھر میں سرمایہ داری نے اس امر کو یقینی بنایا ہے کہ دولت کم سے کم ہاتھوں میں مرتکز رہے۔ بھارت میں ۶۳ر امیر ترین لوگ ۱۳۰ر کروڑ سے زائد لوگوں کے لیے پیش کیے گئے، جو ۲۰۱۸ـ۱۹ء کے یونین بجٹ سے زیادہ دولت رکھتے ہیں۔ ایک حالیہ آکسفام تحقیق سے معلوم ہوا کہ بھارت میں کورونا وبا کے دوران جبکہ لاک ڈاؤن کے دوران کروڑوں لوگ روزگار سے ہاتھ دھو بیٹھے (اپریل ۲۰۲۰ء میں ہر گھنٹے ایک لاکھ ستر ہزار لوگ بے روزگار ہو رہے تھے) بھارت کے ارب پتیوں کی دولت میں ۳۵ فیصد اضافہ ہوا۔ ایک سو امیر ترین لوگوں (ہم انھیں کارپوریٹ طبقہ کہہ لیتے ہیں) نے اتنی دولت کمائی کہ، اگر وہ چاہتے تو، بھارت کے پونے چودہ کروڑ غریب ترین لوگوں میں سے ہر فرد کو ایک لاکھ روپے دیے جا سکتے تھے۔ ایک مرکزی اخبار کی شہ سرخی میں اس خبر کو یوں بیان کیا گیا: ''کورونا سے گہری ہوتی ہوئی عدم مساوات: دولت، تعلیم، جنس''۔ اس رپورٹ اور اس شہ سرخی میں ایک لفظ کم ہے یعنی ذات پات۔

سوال یہ ہے کہ یہ چھوٹا سا کارپوریٹ طبقہ۔ جو بندرگاہوں، کانوں، گیس کے کنووں، ریفائنریوں، ٹیلی کمیونی کیشن، تیز رفتار ڈیٹا اور سیل فون کے نیٹ ورکس، جامعات، پیٹروکیمیکل پلانٹس، ہوٹلوں، اسپتالوں، کھانے کے مراکز اور ٹیلی ویژن کیبل نیٹ ورکس کا مالک ہے، کیا یہ طبقہ بھی، جو واقعتاً بھارت کا مالک و منتظم ہے، کسی ذات کا حامل ہے؟

بہت حد تک اس کا جواب 'ہاں' میں ہے۔ بھارت کی بہت سی بڑی کارپوریشنیں خاندانی ملکیت ہیں۔ کچھ کے نام ہم یہاں بیان کرتے ہیں: ریلائنس انڈسٹریز (مکیش امبانی)، اڈانی گروپ (گوتم اڈانی)، آرسیلر متل (لکشمی متل)، او پی جندل گروپ (ساوتری دیوی جندل)، برلا گروپ (کے ایم برلا)۔ یہ سب لوگ خود کو ویش یعنی تاجر ذات سے بتاتے ہیں۔ یہ محض خدائی عائد کردہ فرض ادا کر رہے ہیں یعنی دولت کما رہے ہیں۔

کارپوریٹ میڈیا کی ملکیت اور ان کے مدیروں، کالم نگاروں اور سینئر صحافیوں کی ذات کے بارے میں ہونے والے تجرباتی مطالعات بتاتے ہیں کہ کس طرح مراعات یافتہ ذاتیں (زیادہ تر براہمن اور بنیے) خبروں (حقیقی اور جعلی ہر دو قسم) کی تشکیل اور ترسیل کے کام پر قبضہ کیے ہوئے ہیں۔ دلت، آدیواسی اور اب تیز رفتاری سے مسلمان بھی اس سارے منظر نامے سے تقریباً غائب ہیں۔ بڑی اور چھوٹی عدالتوں، سول سروسز کے اونچے عہدوں، فارن سروسز، چارٹرڈ اکاؤنٹوں کی دنیا، یا پھر تعلیم، صحت، صحافت میں پُر کشش نوکریوں، یا سرکاری حلقوں میں کہیں بھی صورتحال اس سے مختلف نہیں ہے۔ جبکہ براہمنوں اور ویشوں کی تعداد آبادی کے دس فیصد سے بھی کم ہے۔ ذات پات اور سرمایہ داری نے باہمی عمل سے ایک نہایت تباہ کن اور خصوصی بھارتی خواص کا حامل مرکب تیار کیا ہے۔

وزیر اعظم مودی، جو کانگریس جماعت کی موروثی سیاست پہ حملے کرتے نہیں تھکتے، ان کارپوریٹ خاندانی بادشاہتوں کی حمایت و بڑھوتری میں پوری طرح سے یکسو ہیں۔ وہ پالکی بھی جس کی چلمن کے پیچھے مودی براجمان ہیں، اچھے بُرے سے قطع نظر، بہرحال ویش و براہمن کی خاندانی ملکیتوں میں چلنے والی کارپوریٹ میڈیا سلطنتوں کے کندھوں ہی پر ٹکی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پہ دی ٹائمز آف انڈیا، ہندوستان ٹائمز، انڈین ایکسپریس، دی ہندو، انڈیا ٹوڈے، دائنک بھاسکر، دائنک جاگران وغیرہ۔ ریلائنس انڈسٹریز کے پاس ۲۷ چینلوں کے منتظمانہ حصص ہیں۔ میں نے ''چلمن کے پیچھے بیٹھنے'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا کیونکہ مودی نے اپنے قریباً سات سالہ دور میں کبھی پریس سے براہِ راست خطاب نہیں کیا۔ ایک بار بھی نہیں۔

جب ایک طرف ہم عوام کے ذاتی ڈیٹا کی مائننگ اور ہماری پتلیوں کی اسکیننگ ہو رہی ہے، کارپوریٹ دنیا کے لیے ایک چشم بند نظام لایا گیا ہے تا کہ اسے موعودہ کامل وفاداری پیش کی جائے۔ ۲۰۱۸ء میں ایک انتخابی بانڈ منصوبہ متعارف کروایا گیا تھا، جس میں یہ اجازت دی گئی تھی کہ نامعلوم لوگ سیاسی جماعتوں کو رقوم بھیج سکتے ہیں۔ پس اب ہمارے پاس ایک حقیقی، ادارہ جاتی، سختی سے ہوا بند پائپ لائن موجود ہے جس میں دولت اور طاقت کارپوریٹ اور سیاسی اشرافیہ کے مابین گردش کرتی رہتی ہے۔ پھر ہمیں اس پر زیادہ حیران نہیں ہونا چاہیے کہ بھارتی جنتا پارٹی دنیا کی امیر ترین سیاسی جماعت ہے۔ اور اس سے بھی کم حیرانی اس بات پر

ہونی چاہیے کہ جبکہ ایک طرف یہ چھوٹا سا طبقہ ذات، اشرافیہ، عوام کے نام پر اور ہندو قوم پرستی کے نام پر اس ملک پر اپنی گرفت مضبوط تر کرتا جاتا ہے، تو دوسری طرف اس نے لوگوں کے ساتھ، بشمول اپنے ووٹروں کے، ایک دشمن طاقت کا سا سلوک شروع کر دیا ہے کہ جس سے معاملہ کرنے، چالبازی سے قابو کرنے، گرفت میں لانے، اچانک جا پکڑنے، سختی سے حملہ کرنے اور آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں گھاتی اعلانات اور غیر قانونی قوانین کی قوم بنا دیا گیا ہے۔

گھاتی اعلانات

نوٹ بندی نے راتوں رات معیشت کی ریڑھ مار دی۔

جموں و کشمیر میں آرٹیکل ۳۷۰ کی تنسیخ ستر لاکھ لوگوں کے لیے مہینوں پہ مشتمل ناگہانی عسکری و ڈیجیٹل محاصرے پہ منتج ہوئی (انسانیت کے خلاف ایک ایسا جرم جو ہمارے نام پر کیا گیا) اور پوری دنیا نے یہ عمل دیکھا۔ ایک سال بعد، غیر معمولی عزیمت کے حامل لوگ آزادی کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں باوجود یہ کہ کشمیر کے جسمِ اجتماعی کی ہر ہڈی پے بہ پے سرکاری ظلم کے نتیجے میں ٹوٹ چکی ہے۔

صریحاً مسلم دشمن ترمیمی قانون برائے شہریت اور شہریوں کے قومی کھاتے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم خواتین مہینوں تک احتجاج کرتی رہیں۔ اس کا خاتمہ شمال مشرقی دہلی میں ہونے والے مسلم قتلِ عام پر ہوا، جس میں خدائی فوجداروں نے جلتی پہ تیل ڈالا اور جسے پولیس دیکھتی رہی اور جس کا الزام مسلمانوں پر ڈال دیا گیا۔ سیکڑوں نوجوان مسلمان مرد، طلبہ اور کارکن بشمول عمر خالد، خالد سیفی، شرجیل امام، میران حیدر، نتاشا نروال اور دیونگنا کالیتا جیل میں ہیں۔ احتجاجوں کو یوں پیش کیا جاتا ہے گویا یہ اسلامی جہادی منصوبے ہوں۔

جو خواتین شاہین باغ کے شاندار دھرنے، جو ملک بھر میں ہونے والی مزاحمت کی ریڑھ کی ہڈی تھا، کا ہراول دستہ تھیں، ان کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ وہ تو ''صنفی آڑ'' کے طور پہ استعمال ہو رہی تھیں، اور آئین سے کیے جانے والے عوامی مطالبات، جو قریباً ہر احتجاجی مقام پر کیے گئے تھے، یہ کہہ کر رد کر دیے گئے کہ یہ تو ''سیکولر آڑ'' ہیں۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مسلمانوں سے متعلق ہر شے ایک خود کار طرز پہ ''جہادی'' (یہ اصطلاح غلط طور پہ دہشت گردی کے کنائے کے طور پہ استعمال ہوتی ہے) ہے اور یہ کہ اس کے علاوہ ہر شے محض تفصیلات ہے۔

جن پولیس والوں نے شدید زخمی مسلم مردوں کو قومی ترانہ گانے پہ مجبور کیا، جبکہ وہ سڑک پر ایک دوسرے پہ اٹے پڑے تھے، ان پہ مقدمہ کرنا تو دور کی بات ان کی شناخت تک نہیں ہوئی۔ زخمیوں میں سے ایک بعد ازاں چل بسا، جس کے گلے میں ایک محبِ وطن پولیس لاٹھی گھسیڑی گئی تھی۔ اِس ماہ وزیرِ داخلہ نے دہلی پولیس کو ''دنگوں'' سے نبرد آزما ہونے پر مبارکباد دی۔

اور اب قتلِ عام کے ایک سال بعد، جبکہ مجروح کمیونٹی سنبھلنے کی کوشش کر رہی ہے، بجرنگ دَل اور وشوا ہندو پریشاد اعلان کر رہے ہیں کہ وہ ایودھیا میں، انھی گلیوں میں جہاں قتلِ عام ہوا، رام مندر کی تعمیر کے لیے راتھ یاترا اور موٹر سائیکل پریڈ کر کے چندہ جمع کریں گے۔

ہمیں گھاتی لاک ڈاؤن کا بھی سامنا کرنا پڑا یعنی جب محض چار گھنٹے کے نوٹس پہ ۱۳۰ کروڑ سے زائد عوام کو محصور کر دیا گیا۔ لاکھوں شہری مزدوروں کو گھر جانے کے لیے ہزاروں کلومیٹر پیدل چلنے پر مجبور کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ انھیں مجرموں کی طرح پیٹا بھی گیا۔

ایک طرف وبا بڑھ رہی تھی تو دوسری طرف، ریاست جموں و کشمیر میں سٹیٹس تبدیلی کے ردِ عمل کے طور پہ، چین نے لداخ میں بھارتی علاقے کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا۔ ہماری بیچاری حکومت کو یہ ظاہر کرنے پر مجبور کیا گیا گویا یہ قبضہ ہوا ہی نہیں۔ کوئی جنگ ہوتی ہے یا نہیں، منفی نمو کی حامل معیشت اپنے ہزاروں سپاہیوں کو مسلح اور جنگ کے لیے ہمہ وقت تیار رہنے کے لیے پیسہ صرف کرتی رہے گی۔ منفی درجہ حرارت میں بہت سے سپاہیوں کی جانیں تو محض موسم ہی کی نذر ہو جائیں گی۔

ان تھوپے گئے مصائب کے بعد اب ہمیں تین کسان قوانین کا بھی سامنا ہے جو بھارتی زراعت کی کمر توڑ دیں گے، سارا کنٹرول کارپوریشنوں کے ہاتھ میں دے دیں گے اور کسانوں کو کسی بھی قانونی چارہ جوئی سے صاف روک دیں گے، ان کے آئینی حقوق کا تو ذکر ہی کیا۔

یہ سب کچھ دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے ہم ایک گاڑی کو پرزے پرزے ہوتے دیکھیں، اس کا انجن ٹوٹتے، اس کے پہیے الگ ہوتے، اس کی نشستیں بکھرتے، اور اس کا ڈھانچہ ہائی وے پہ پڑا دیکھیں جبکہ دوسری گاڑیاں، جن کے ڈرائیوروں نے اونی لباس اور شاندار سینگ نہیں پہنے ہوئے، قریب سے گزرتی جائیں۔ (---جاری ہے!)

(بحوالہ: ''جائزہ ڈاٹ پی کے''۔ ترجمہ: کبیر علی)

آپ کی توجہ مطلوب ہے!

۱۔ اسلامک ریسرچ اکیڈمی' کراچی ہر ماہ کی پہلی اور سولہویں تاریخوں کو ''معارف فیچر'' شائع کرتی ہے۔ ''فیچر'' بلا قیمت ارسال کیا جانے والا پندرہ روزہ ہے۔ جب بھی کسی صاحبِ علم یا طالبِ علم کی طرف سے ''معارف فیچر'' جاری کرنے کی خواہش کا اظہار ہم تک پہنچتا ہے' ہم بلا تاخیر پرچہ جاری کر دیتے ہیں۔

۲۔ لیکن جیسا کہ بہت سے قارئین کو علم ہے کہ ایک سال تک پرچہ جاری رکھنے پر ادارہ کو تقریباً ۵۰۰/= روپے کا خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ہم بجا طور پر یہ امید رکھتے ہیں کہ پرچہ ملنے کے بعد ہمارے قارئین میں سے جن جن کے لیے ممکن ہوگا' وہ کم از کم اپنے حصہ کی رقم (۵۰۰ روپے سالانہ) از خود اور بلا طلب کسی مناسب ذریعہ سے ''اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی'' کو بھجوا دیں گے۔ نیز خود ہی اگلے برسوں کے لیے بھی اس طریقے پر عامل رہیں گے۔ ان شاء اللہ!

۳۔ زرِ تعاون (Contribution) یا عطیہ (Donation) بھیجنا آپ کا خالص رضا کارانہ (Voluntary) عمل ہے۔ ہم اسے نہ لازم کرتے ہیں' نہ طلب کرتے ہیں' نہ پرچہ بھیجنے کی شرط قرار دیتے ہیں اور نہ اس کی عدم وصولی پر ''فیچر'' کی ترسیل منقطع کرتے ہیں۔

ہم آپ کے تعاون' دعاؤں' مشوروں اور تبصروں کے لیے ممنون ہوں گے۔

نوٹ:۔ زرِ تعاون اور عطیات کے چیک/ ڈرافٹ وغیرہ پر

Islamic Research Academy Karachi

لکھیے/لکھوایئے۔ براہِ کرم کراچی سے باہر کے بینک کا چیک نہ بھیجیے۔ خاصی رقم بینک چارجز کے نام سے کٹ جاتی ہے۔ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کے لیے ہمارا پتا ہے:

D-35, Block-5, F.B. Area, Karachi - 75950, Tel: (92-21) 36809201, 36349840

میانمار میں کیا ہوا؟

۲۸ جنوری ۲۰۲۱ء کو میانمار (برما) کی وزیراعظم آنگ سانگ سوچی نے فوجی حکام سے مذاکرات کی ناکامی کے پیشِ نظر گرفتاری سے بچنے کی کوششوں کے دوران سامان پیک کرتے ہوئے اپنا سیل فون بھی تلف کردیا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں کم و بیش چار دن قبل ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ فوج منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر دوبارہ اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ نومبر ۲۰۲۰ء کے عام انتخابات میں آنگ سانگ سوچی کی نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی کی شاندار کامیابی کے بعد سے فوج مختلف حوالوں سے انتخابی نتائج کا جائزہ لینے کا مطالبہ کررہی تھی مگر آنگ سانگ سوچی نے اس بار نہ جھکنے کا فیصلہ کررکھا تھا۔ میانمار میں جو کچھ ہوا اُس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لیے رائٹرز نے سویلین حکومت اور فوج کے درمیان مذاکرات سے باخبر ۹؍افراد سے رابطہ کیا تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ ہوا کیا ہے۔ انہوں نے شناخت خفیہ رکھے جانے کی شرط پر بعض ایسی باتیں بھی بتائیں جو اس سے قبل منظرعام پر نہیں آئی تھیں۔

۵ کروڑ ۳۰ لاکھ کی آبادی والے جنوب مشرقی ایشیا کے ملک میانمار (برما) میں فوج نے ۱۹۶۲ء سے ۲۰۱۵ء تک حکومت کی۔ ۲۰۱۵ء میں ملک کے پہلے آزادانہ و شفاف عام انتخابات منعقد ہوئے تو نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی نے کامیابی حاصل کی اور طویل مدت تک جمہوریت کے لیے جدوجہد کرنے کے صلے کے طور پر امن کا نوبیل انعام پانے والی آنگ سانگ سوچی نے وزیراعظم کا منصب سنبھالا۔ نصف صدی سے بھی زائد مدت کی فوجی حکمرانی کے دوران میانمار بدحال اور عالمی برادری میں الگ تھلگ رہا ہے۔

۲۸ جنوری ۲۰۲۱ء کو سویلین حکومت اور فوجی حکام کے درمیان کئی دنوں کی بات چیت کے بعد صاف دکھائی دینے لگا کہ اب مفاہمت ممکن نہیں۔ فوج کا مطالبہ تھا کہ ۸ نومبر ۲۰۲۰ء کے عام انتخابات کے حتمی نتائج کا جائزہ لینے کا موقع دیا جائے۔ آنگ سانگ سوچی نے اس کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔ مذاکرات کے دوران فوجی حکام نے سویلین حکومت کے نمائندوں پر الزام عائد کیا کہ وہ بہت سخت گیر اور گستاخ ہیں۔ آنگ سانگ سوچی اور فوج کے نمائندوں کے درمیان مذاکرات دارالحکومت نیپیدا اور تجارتی دارالحکومت ینگون میں ہوئے۔ سوچی کے نمائندے کیا ٹنٹ سوئی ان مذاکرات کے اختتام پر خاصے مضمحل و شکست خوردہ دکھائی دیے۔ شاید انہیں جلد رونما ہونے والے واقعات کا اندازہ ہوچکا تھا۔ گفت و شنید سے آگاہ ذرائع نے بتایا کہ سویلین حکومت کے نمائندوں کا کہنا تھا کہ ان کے پاس طاقت نہیں کیونکہ وہ کوئی باضابطہ فورس نہیں رکھتے اس لیے وہ جمہوریت کی بساط کو الٹے جانے سے روکنے کی پوزیشن میں بھی نہیں۔

بات چیت ابھی جاری ہی تھی کہ نیپیدا اور ینگون میں فوجی گاڑیاں سڑکوں پر دکھائی دینے لگی تھیں۔ سابق دارالحکومت ینگون میں بدھ مت کے بڑے معبد شویڈاگون پیگوڈا کے نزدیک فوج کے ہزاروں حامی جمع ہوئے۔ انہوں نے میڈیا کے ان نمائندوں کو بھی ڈرایا دھمکایا جنہوں نے ان سے انٹرویو کرنے کی کوشش کی۔

۳۰ جنوری کو فوج نے اس افواہ کی تردید کی کہ وہ اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ فوج کے نمائندے نے میڈیا سے گفتگو میں کہا کہ ہر حال میں آئین کا دفاع کیا جائے گا اور ہر کام آئین کے مطابق ہوگا۔ ۲۰۰۸ء کے آئین کے مطابق ملک کا نظام جمہوری ہے، تاہم ہنگامی حالت میں فوج کو اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کا اختیار بھی حاصل ہے۔ فوج نے آئین کے تحت اور بھی بہت کچھ اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ دفاع و داخلہ سمیت کئی اہم وزارتیں فوج کے کھاتے میں ہیں اور پارلیمان میں اس نے اپنے لیے نشستوں کا کوٹا بھی رکھا ہے۔

۳۱ جنوری اور یکم فروری کی درمیانی شب وزرا، قانون سازوں، مصنفین، فلم سازوں اور سیاسی کارکنوں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اُسی صبح فوج نے اقتدار میں باضابطہ واپسی کا اعلان کردیا۔ آنگ سانگ سوچی کو گھر میں نظربند کردیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ محض خانہ پُری کے طور پر واکی ٹاکیز کی غیر قانونی برآمد میں ملوث ہونے کا خاصا بھونڈا الزام عائد کیا گیا۔

۲ فروری کو فوج نے کہا کہ ۸ نومبر ۲۰۲۰ء کے عام انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کی گئی ہے اور آنگ سانگ سوچی نے مطالبے کے باوجود اس حوالے سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ غیر جانبدار مبصرین کا کہنا ہے کہ عام انتخابات میں برائے نام دھاندلی ہوئی، یعنی نتائج کو متنازع قرار نہیں دیا جاسکتا۔ نومبر ۲۰۲۰ء کے عام انتخابات میں فوج کی حمایت یافتہ یونین سالیڈیریٹی اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی کو عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ فوج کا دعویٰ ہے کہ ملک کے تین کروڑ ووٹوں میں ایک تہائی میں جعل سازی ہوئی ہے۔ الیکشن کمیشن کا کہنا ہے کہ اگر بے قاعدگیوں کی تحقیقات کرائی جائے تو بھی حتمی انتخابی نتائج پر کچھ خاص اثر نہیں پڑے گا۔ الیکشن کمیشن نے مطالبے کے باوجود ووٹروں کی حتمی فہرستیں فوج کے حوالے کرنے سے اب تک واضح طور پر گریز اور انکار کیا ہے۔

۲۶ جنوری کو فوجی ترجمان زامن ٹن نے میڈیا سے گفتگو کے دوران سویلین حکومت کا تختہ الٹنے کے خدشے کو بے بنیاد قرار دینے سے گریز کیا تھا، جس سے عوام کو اندازہ ہوگیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ایسا ویسا ہونے والا ہے۔ آرمی چیف جنرل من آنگ ہلینگ نے کہا کہ اگر آئین پر عمل نہ کیا جائے تو اُسے منسوخ بھی کیا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ جنرل من آنگ ہلینگ اور آنگ سانگ سوچی کے درمیان تعلقات کشیدہ رہے ہیں اور انہوں نے کئی ماہ تک بات چیت بھی نہیں کی تھی۔ ویسے فوج اور آنگ سانگ سوچی کی نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی کے تعلقات ۱۹۸۰ء کے عشرے سے کشیدہ چلے آرہے ہیں۔

میانمار کی فوج کا مطالبہ تھا کہ ۸ نومبر ۲۰۲۰ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آنے والی پارلیمان کے افتتاح کی تاریخ (یکم فروری) تبدیل کی جائے۔ دوم یہ کہ الیکشن کمیشن تحلیل کیا جائے اور سوم یہ کہ فوج کو ۸ نومبر کی پولنگ کے پورے عمل کا جائزہ لینے کا موقع دیا جائے۔ ۲۹ جنوری کو آنگ سانگ سوچی کی ہدایت پر پارلیمنٹ کا افتتاح ایک دن کے لیے موخر کردیا گیا۔ اس سے قبل ہی فوج اور سویلین حکومت کے درمیان بات چیت مکمل طور پر ناکام ہوگئی۔

آنگ سانگ سوچی کو صدر کا تقرر بھی کرنا تھا۔ خیال کیا جارہا تھا کہ شاید وہ جمہوری سیٹ اپ کو بچانے کے لیے جنرل من آنگ ہلینگ کو (ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد) یا پھر فوج کی کسی اور پسندیدہ شخصیت کو صدر مقرر کریں گی۔ آئین کے تحت آنگ سانگ سوچی خود صدر نہیں بن سکتیں، کیونکہ ان کی اولاد غیر ملکی شہریت کی حامل ہے۔

یکم فروری کی شب ملک بھر میں سیاست دانوں، نمایاں سیاسی کارکنوں، قانون سازوں اور فوج کے مخالف نمایاں بدھ راہبوں کے گھروں پر چھاپوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان میں سے بیشتر کو یا تو گرفتار کیا گیا یا پھر گھروں تک محدود رہنے کی

باقی صفحہ نمبر ۴

MA'ARIF FEATURE • Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950